جون ۱۹۲۹ء

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۷

معارف

مجلس المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت ۵ سالانہ

مطبع معارف میں چھپکر

دار المصنفین اعظم گڈھ سے شایع ہوا

فہرست کتبخانہ تجارتی دار المصنفین اعظم گڈھ

علامہ شبلی نعمانی

سیرة النبی صلعم حصہ اول، طبع دوم تقطیع ۲۰×۲۶ حالات نبوی از ولادت تا ختم غزوات، قیمت باختلاف کاغذ اور

ایضاً حصہ دوم، کارنامہ نبوی تکمیل شریعت، تاریخ احکام، وفات، اخلاق و شمائل وغیرہ طبع اول قیمت قسم اعلی تقطیع کلان

ایضاً حصہ دوم طبع دوم قیمت باختلاف کاغذ تقطیع خورد

ایضاً حصہ سوم تقطیع کلان قسم اول، قسم سوم

الفاروق حضرت فاروق اعظم کی لائف اور طرز حکومت مطبوعہ معارف پریس، قیمت

المامون خلیفہ مامون الرشید کے عہد سلطنت کے حالات مطبوعہ معارف پریس

الغزالی، امام غزالی کی سوانحعمری اور ان کا فلسفہ مطبوعہ معارف پریس

سیرة النعمان، امام ابو حنیفہ کی سوانحعمری اور ان کے اجتہادات اور مسائل، قیمت

سوانح مولینا روم، مولانا جلال الدین رومی کی مفصل سوانحعمری، مثنوی شریف اور دیگر تصنیفات پر تقریظ،

رسائل شبلی، مولانا کے نیارہ مختلف علمی مضامین کا مجموعہ، قیمت

مقالات شبلی، مولانا کے تیرہ مختلف مضامین کا مجموعہ، قیمت

شعر العجم حصہ اول، شاعری کی حقیقت، فارسی شاعری کا آغاز و قدما کا دور، قیمت

ایضاً حصہ دوم، شعرائے متوسطین کا دور،

ایضاً حصہ سوم، شعرائے متاخرین کا دور،

ایضاً حصہ چہارم، فارسی شاعری پر ریویو،

ایضاً حصہ پنجم، فلسفیانہ صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تبصرہ،

الانتقاد علی تمدن الاسلامی، جرجی زیدان کے تمدن اسلامی پر عربی میں ریویو، قیمت

موازنۂ انیس و دبیر، مرثیہ کی تاریخ اردو میں اصولی تنقید اور فصاحت و بلاغت کی تشریح اور میر انیس کی شاعری کا ان معیارات سے موازنہ

سفرنامۂ روم و مصر و شام، مطبوعہ معارف پریس، قیمت

مضامین عالمگیر، شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر پر اعتراضات اور ان کے جوابات، قیمت باختلاف کاغذ و طبع

علم الکلام، مسلمانوں کے علم کلام کی تاریخ، اس کی عہد بعہد کی ترقیان اور علمائے متکلمین کے نظریات اور مسائل، طبع چہارم مطبوعہ معارف پریس

الکلام، مولانا کی مشہور تصنیف جدید علم کلام جس مین عقلی دلائل سے مذہب کو فلسفہ کے مقابل مین ثابت کیا ہے، اور ملاحدہ و منکرین کے دلائل کا رد کیا ہے، طبع سوم مطبوعہ معارف پریس، قیمت

کلیات، مولانا کے تمام فارسی قصائد، غزلیات، مثنویات کا مجموعہ جو اب تک متفرق طور سے دیوان شبلی، دستۂ گل، بوئے گل کے ناموں سے چھپے تھے سب اس مین یکجا کر دیے گئے ہین، ولایتی کاغذ پر نہایت عمدہ چھپا ہے، قیمت

کلیات شبلی اردو، مولانا کی تمام اردو نظمون کا مجموعہ جس مین مثنوی صبح امید، قصائد جو مختلف مجلسون مین پڑھے گئے اور وہ تمام سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمین جو کانپور، ترکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ وغیرہ کے متعلق لکھی گئی تھیں یکجا ہین، یہ نظمین درحقیقت مسلمانون کے جدوجہد کی ایک مکمل تاریخ ہے، لکھائی چھپائی، کاغذ اعلی قیمت

مکاتیب شبلی طبع دوم، مولانا کے خطوط و مکاتیب کا مجموعہ جو علمی، قومی، ادبی، اصلاحی، مذہبی معلومات کا خزانہ ہے، حصہ اول، حصہ دوم

مولانا حمید الدین صاحب بی اے

عربی زبان مین مولانا نے قرآن پاک کی تفسیر کا جو سلسلہ شروع کیا حسب ذیل نمبر چھپکر تیار ہین، یہ تفسیر بالکل جدید طرز پر لکھی گئی ہے جس کی خاص خصوصیت قرآن پاک کی باہم آیتون کا ربط و نظام اور بعض مجہول مستورہ کا تشفی بخش انکشاف ہے

تفسیر سورة الذاریات		تفسیر سورہ لہب	
تفسیر سورہ والتین		تفسیر سورہ الکوثر	
تفسیر سورة القیامہ		تفسیر سورہ عبس	

مجلد بست و سوم ۲۳ | ماہ ذیحجہ ۱۳۴۷ھ مطابق ماہ جون ۱۹۲۹ء | عدد ۶

مضامین

شذرات

عموماً درسگاہوں اور قومی اداروں کی طرف سے کوئی نہ کوئی اخبار یا رسالہ شایع ہوتا ہے، جسکو وہاں کا آرگن، نقیب، اور زبانِ حال سمجھا جاتا ہے، اسکا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنی درسگاہ اور ادارہ کے مقاصد بیان کرے، اور لوگوں کو اس کی حمایت اور قدردانی پر آمادہ کرے، اسمیں شک نہیں کہ اس اصول کے مطابق معارف بھی دار المصنفین کا نقیب اور آرگن ہے، مگر اس بے عملی کو دیکھیے کہ اس سے یہ کام بھی انجام نہیں پاتا، سالہا سال گزر جاتے ہیں اور دار المصنفین کے مقاصد اور حالات کی تشریح میں ایک لفظ بھی اسکی زبان سے نہیں نکلتا، جب اپنا یہ حال ہے تو دوسروں کا کیا گلہ کیجیے،

دار المصنفین کن مقاصد کے ساتھ عالم وجود میں آیا اور کیا اغراض اسکی ذات سے وابستہ تھیں، شاید یہ کہانی لوگوں کی یاد سے فراموش ہوگئی ہو، اس لیے ضرورت ہے کہ ایک دفعہ پھر یہ سب کو سنائی جائے، گو ہمیں معلوم ہے،

انچہ رحم از دل برد تاثیر فریادِ منست

انچہ نسیاں آورد خاصیتِ یادِ منست

دار المصنفین درحقیقت کسی دار الاشاعت، کسی مطبع، کسی رسالہ کسی تعمیر کا نام نہ تھا، بلکہ اس عہد میں وہ مسلمان نوجوانوں کی دماغی و ذہنی تربیت کیلیے وہ گوشۂ امن بنا یا ہوا تھا جسکی تمنا اپنے زمانہ میں لسان الغیب شیراز نے کبھی ظاہر کی تھی،

دو یار زیرک و از بادہ کہن دو منے

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

"گوشۂ چمن" تو اس ویرانہ (احاطۂ دار المصنفین) کو آپ کہہ سکتے ہیں، "کتاب" خانہ بھی ایک حد تک یہاں موجود ہے،

فراغتِ خاطر کا سامان بھی کچھ ہوگیا ہے، "دو یار زیرک" کے بجائے چار چار لائق و فاضل رفقا یہاں ہر وقت مصروف و مشغول ہیں، اگر جو چیز یہاں نہیں ہے وہ "بادۂ کہن دو منے" ہے، "کہن" کیا "نو" بھی نہیں، اور "دو من" کیا "ایک چھٹانک" بھی نہیں، اور اسی کی کمی نہ صرف یہاں بلکہ ہمارے ہر قومی ادارہ میں نمایاں ہے،

آپ سمجھے کہ قومی اداروں کیلیے بادۂ کہن کیا ہے؟ وہ سرمایہ ہے، اسی شراب کے نشہ سے دنیا کی ہر چیز مست و سرخوش ہے، اس سے قومی ادارے بھی مستثنیٰ نہیں، سوال یہ ہے کہ یہ کہاں سے آئے؟ اور کیونکر ملے،؟

جہانتک دار المصنفین کا تعلق ہے، ہم نے اور ہمارے رفقا کار نے یہ طے کر لیا ہے کہ کچھ نہ ملنے پر بھی ہم سب کچھ کرینگے، اور ایثار و اخلاص کے دعوی کو انشاء اللہ کبھی شرمندہ نہ ہونے دینگے، مگر کتابیں کیونکر خریدی جائیں، اس ویرانہ کو واقعی گوشۂ چمن کیونکر بنایا جائے، یارانِ زیرک کی مزید تعداد کیونکر حاصل کیجائے، اور انکے لئے ممکن فراغِ خاطر کا سامان کہاں سے کیا جائے؟

ان سب کو چھوڑیے، دار المصنفین کا جو اصلی مقصد ہے کہ ایک ایسا گوشہ بنایا جائے جس کی تمامتر فضا علمی ہو، اسکے لئے ضرورت یہ ہے کہ خود دار المصنفین کے احاطہ میں اسکے رفقا کی سکونت کیلیے مکانات ہوں تاکہ اسکے در و دیوار سے ایک ہی جذبۂ علم و خدمت نمایاں ہو۔ اور شہر و آبادی کے بیرونی تاثرات سے اسکی آب و ہوا محفوظ رہے، یہ کیونکر انجام پائے؟

دار المصنفین کے عام رفقا کے قیام کیلیے ہم نے شروع ہی میں چند ہزار کے خرچ سے پانچ چھ کمروں کی ایک سلسل قطار بنالی تھی، مگر اب ضروریات اور حالات نے ترقی کی ہے، اب کم از کم چار مستقل مکانوں کی ضرورت ہے جنمیں مصنفین اور خاص رفقا قیام کر سکیں اور باہر سے آنے والے مصنفین اور اہل قلم عارضی طور سے مہمان کی حیثیت سے ٹھہر سکیں، اسکے علاوہ ایک مسجد کی ضرورت ہے جسمیں ساکنین دار المصنفین پنجگانہ نماز ادا کر سکیں، ان سب کیلیے ہمکو کم از کم پچیس ہزار کی ضرورت ہے،

اس لئے یہ مقصد نہیں کہ عام ناظرین سے ہم دو دو چار چار روپے کے چندوں کی اپیل کرتے ہیں، علم کی نعمت اس گداگری اور دریوزہ گری سے بلند تر ہے، البتہ ہم نے اپنے خاص احباب اور قدرافزاؤں سے یہ خواہش کی ہے کہ اگر پچیس ۲۵ افراد ایسے اٹھ کھڑے ہوں جو ایک ایک ہزار کی رقم جمع کر کے اپنی علم دوستی کا ثبوت دیں، تحریک کا آغاز کر دیا گیا ہے،

مسجد کے سنگِ بنیاد رکھنے کا عزم ہو چکا ہے اور جولائی کی تیرہ تاریخ کو جب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صدر الصدور دولت آصفیہ یہاں تشریف فرما ہونگے انھیں کے مبارک ہاتھوں سے مسجد کا سنگِ بنیاد بھی رکھدیا جائے گا۔

البتہ ہمارے عام ناظرین اور قدرشناس جنکو ہمارے کاموں کے ساتھ دلچسپی اور ہمدردی ہو وہ اسی طرح ہماری مدد کرسکتے ہیں جس طرح دو سال پہلے انھوں نے کتبخانہ کی تعمیر میں ہماری مدد کی تھی یعنی یہ کہ وہ بیس روپے سال ادا کر کے ہمارے رکن بنجائیں اور ہماری سال کی تمام مطبوعات کے مستحق ٹھہریں، یا یہ کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہماری کتابیں خود خریدیں اور اپنے احباب سے انکی خریداری کی سفارش کریں، اس طریقہ سے وہ ہم خرما و ہم ثواب کے اصول پر وہ خود اپنی اور ہماری دونوں کی مدد کرسکتے ہیں، دارالمصنفین کی مطبوعات کی فہرست درخواست پر مفت روانہ کیجائیگی،

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے چند نوجوان تعلیم یافتوں نے ایک بڑے پرانے بزرگ کے نام پر خضر راہ کے نام سے ایک ماہوار علمی و ادبی رسالہ لکھنؤ سے جاری کیا ہے اسکے چند نمبر شایع ہو چکے ہیں، اور ہمکو یہ ظاہر کرنے میں خوشی ہے کہ اردو کے عام رسالوں کی حیثیت کو پیش نظر رکھکر انھوں نے اپنا امتیاز کو قایم رکھا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس درسگاہ نے اپنے تعلیم یافتوں میں علم و فن کی خدمت کا جو جذبہ پیدا کیا ہے وہ اب نئی نئی صورتوں میں ظاہر ہو رہا ہے، اسی کے ساتھ اسکے اڈیٹر مولوی حاجی علی صاحب ندوی سے یہ توقع بھی ہے کہ وہ لوگوں کی اصل سطح نظر کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینگے یعنی اس زمانہ کے رنگ، مذاق اور طلب کے مطابق ہر پیرایہ میں دین کی خدمت، ہمارے ادبیات، ہمارے علمی مضامین، ہماری تحقیقات ہر چیز کی باطنی سطح دین اور محض دین کی خدمت ہے، خیالات مسائل اور تحقیقات میں اعتدال و توسط کی صراط مستقیم سے ہٹنے نہ پائیں، رسالہ کی قیمت للعہ سالانہ اور ضخامت ۴۸ صفحے ہوگی، پتہ ندوہ لکھنؤ، علم دوست حضرات سے امید ہے کہ وہ اس نوجوان رسالہ کی ہمت افزائی فرما کر اسکو اپنے فرائض کے انجام دینے کے قابل بنا دینگے،

مقالات

"ہندوکش" عالمگیر کے عہد کی

دو عجیب ہندو کتابیں[1]

جامعہ ملیہ کی پُر اصرار دعوت پر مجھے ایک ہفتہ کیلئے جامعہ آنا پڑا اور اسی تقریب سے اسکے کتبخانہ کی سیر کرنی پڑی، ارباب جامعہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے آٹھ برس کی مختصر مدت میں اپنے دوسرے شعبوں کے ساتھ اپنے کتبخانہ کو بھی قابل قدر حد تک وسعت دی، اسوقت اسکے کتبخانہ میں کم و بیش آٹھ ہزار کتابیں ہیں جنمیں عربی، فارسی، انگریزی، اور اردو کی کتابیں داخل ہیں جو قرینہ کیساتھ الماریوں میں رکھی ہیں، اور مرتب ہیں لیکن ڈھائی سو کے قریب عربی اور فارسی کی قلمی کتابیں ہیں جنکی ہنوز ترتیب کی نوبت نہیں آئی تھی، مینے اپنے مختصر قیام میں ان کتابوں کو دیکھا اور انمیں بعض ایسی کتابیں پائیں جو مختلف حیثیتوں سے قدر کے قابل تھیں، منجملہ انکے دو کتابیں مجھے نہایت عجیب معلوم ہوئیں کہ ان کا کوئی نسخہ اب تک میری نظر سے نہیں گزرا تھا،

ان دونوں کتابوں کی ندرت اور قدر کا سبب یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں اس اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کی تصنیف ہیں جس کو اسکے دشمن اور مخالف، ہندوکش، ہندو علوم و فنون کا برباد کرنیوالا، ہندو مذہب کو تباہ کرنے والا، ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانیوالا مشہور کرتے رہے ہیں لیکن دوسری شہادتوں اور دلیلوں کے ساتھ آج یہ دو مردہ خاموش کتابیں زندہ اور گویا شاہد ہیں جو علی الاعلان یہ گواہی دیتی ہیں کہ اس مرحوم بادشاہ پر یہ تمام الزام تہمت ہیں،

ان میں سے ایک کتاب کا نام "مت ابچرا" اور دوسری کا نام "ردِّ کفر" ہے، یہ دونوں کتابیں اپنے عہد کے دو مخالف اور متضاد منظروں کو پیش کرتی ہیں، پہلی کتاب ایک پکے ہندو کی تالیف ہے اور دوسری ایک نو مسلم ہندو کی،

---

[1] یہ مضمون پہلے "حق" بحیدر آباد کے اصول کے مطابق جامعہ کو دیا گیا تھا، لیکن اسی اصول کی بنا پر دوسری جگہ ناظرین معارف کا بھی حق ہے اسلئے آج انکی خدمت میں بھی پیش کیا جاتا ہے،

"سلیمان"

پہلی کتاب کا مقصد سنسکرت نہ جاننے والے ہندوؤں کو انکے مذہب سے آگاہ کرنا ہے، اور دوسری کا بت پرست ہندوؤں کو اسلام کا راستہ دکھانا ہے، ان دونوں کتابوں کی زبان فارسی ہے جو اس زمانہ میں تمام ہندوستان کی ادبی اور علمی زبان تھی،

امرت اچھرا

یہ کتاب بڑی تقطیع کے ۲۱۴ صفحوں میں ہے، کتاب کا یہ نسخہ فرخ آباد میں ۱۴ فروری ۱۸۴۷ء مطابق ۹ ربیع الاول سنہ ۱۲۶۳ھ کو اختتام کو پہنچا ہے، کاتب کا نام سید کلام الدین شاہ قادری ساکن فرخ آباد ہے، کاتب مذکور نے یہ نسخہ قاضی محمد غلام محی الدین خاں سررشتہ دار محکمہ کچہری صدر امین عدالت کیلئے لکھا ہے جیساکہ اسکے آخر میں بیان ہے،

کتاب کی فارسی زبان خاصی ہے، جا بجا اصطلاحات ہندی اور سنسکرت کے استعمال کئے ہیں، افسوس ہے کہ یہ نسخہ بیحد غلط ہے، دیباچہ میں بیان کیا گیا ہے، کہ جاک ملک (اور خاتمہ میں جاگ ولگ ہے) نام ایک رکھیسر (؟) نے بکرماجیت کے زمانہ میں اس کتاب کو اشلوک میں لکھا تھا، اس کا نام "سمرت جاک بلک" مشہور ہو گیا تھا، چونکہ وہ بہت مشکل کتاب تھی اسلئے گوشایش کیا یزد (؟) نے اسکو نئے سرے سے مرتب کیا، اور اسکا خلاصہ کیا اور "مت اچھرا" نام رکھا، اسی خلاصہ کا سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں لعل بہاری ولد کاہید سنگھ نے جو بھوجپور ضلع شاہ آباد قنوج کا رہنے والا تھا، اور جو اورنگ زیب کے درباری امیر اللہ وردی خان کا متوسل تھا، سنہ ۱۰۹۰ھ میں سوبھاسکر پنڈت کی مدد سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، تاکہ سنسکرت سے ناواقف اسکو سمجھ سکیں، اور فائدہ اٹھائیں، یہ سوبھاسکر پنڈت سنسکرت کے بڑے ماہر تھے، اسلام آباد عرف بنجھولی واقع سرکار گورکھپور کے باشندہ تھے،

کتاب کا موضوع جیساکہ دیباچہ میں ہے، "احکام و مذاہب وادامر و مناہی (نواہی؟) ہنود" ہے کتاب تین مقالوں پر منقسم ہے، اور ہر مقالہ میں متعدد فصلیں ہیں۔

مقالۂ اول "در آچارا دھیائے کہ آنرا بزبان عرب عبادت گویند" اس میں ۲۹ فصلیں ہیں،

مقالۂ دوم "در بیوہارا دھیائے کہ عبادت از معاملات باشد" اس میں ۴۵ فصلیں ہیں،

مقالۂ سوم "در پرایشچت ادھیائے کہ آں را کفارت (کفارہ؟) خوانند" اس میں ۷ فصلیں ہیں،

فصلوں کی تفصیل تو مشکل ہے مگر اس ترتیب تعبیر سے صاف نظر آتا ہے کہ اس زمانے کے "روشن خیال" ہندوؤں کی کوشش تھی کہ وہ اپنے شاستر کو اسلامی فقہ کے نمونہ پر تیار کریں جس طرح آج ہمارے محکوم روشن خیال اپنی اسلامی فقہ کو انگریزی قانون کی صورت میں ڈھالنے کیلئے بیقرار ہیں،

اس کتاب کے دیباچہ میں ہندوکش عالمگیر کو جن القاب و آداب سے یاد کیا گیا ہے وہ آج ہمارے ہندو بھائیوں کے پڑھنے کے لائق ہے،

"اکنوں کہ درین عہد بادشاہ خلافت پناہ، عادل مظفر، مؤید بظل اللہ، سلیمان بارگاہ، مظہر الطاف الٰہی، مطلع انوار بادشاہی، مجسم داد و کرم، قامع آثار جفا و ستم، برداشتہ حضرت منان، گماشتۂ ایزد سبحان، خورشید برج خلافت، مشتری آسمان سلطنت، ظل ظلیل سبحانی، واسطۂ انتظام انسی و جانی، شیرازۂ نسخۂ اسلام، ماحی بدعت کفر و ظلام، مالک ہفت اقلیم زینت افزائے تخت و دیہیم، وارث ملک سلیمانی، فروغ دودمان صاحب قرانی، خسرو فلک اقتدار، بادشاہ خورشید اشتہار، سلطان بن سلطان، خاقان بن خاقان، مجیب؛ فرمانروائے جلال و داضی (؟)، ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی، خلد اللہ ملکہ و سلطانہ کہ دور ش چوں دور قدح پر نشاط، و زمانش مانند ایام شباب پر سرور و انبساط، روز بازار فضل و دانش است، ہندی نژادان فارسی دوست را بنظم و نثر از حد بیشتر است"

غور کیجئے کہ یہ کتاب سرکاری حیثیت سے نہیں لکھی جا رہی تھی، اور نہ بادشاہ کے دربار میں پیش کئے جانے کی غرض سے ترجمہ کی جا رہی تھی، مگر باایں ہمہ ان جذبات کا ادا ہونا یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس عہد کے ہندو اسکو کیا سمجھ رہے تھے اور آج اسکو کیا سمجھ رہے ہیں،

آگے چل کر وہ اپنا اور اپنے آقا کا کس محبت اور منت شناسی کے جذبہ کے ساتھ ذکر کرتا ہے،

"پیش نہاد خاطر احقر العباد لعل بہاری ولد رائے پرمرائے کاہید سنگھ متوطن بھوجپور من مضافات سرکار شاہ آباد عرف قنوج متعلق بصوبۂ اکبر آباد کہ از گلے پرورش و تربیت یافتۂ یک خاندان والا دودمان عز و علا نواب سپہر جناب خورشید القاب، عالیات قباب رکن السلطنۃ العظمیٰ، عضد الخلافۃ الکبریٰ، سزاوار ہست آں عوقی چراغ دودمان سلجوقی مہبط الطاف بادشاہی، منظور انظار خلیفۂ الٰہی نواب اللہ وردی خان عالمگیر شاہی است"

کیا یہ سطریں آج انقلاب روزگار کی تصویریں نہیں؟

۲- ردّ الکفر

دوسری کتاب کا نام "رد الکفر بحجۃ القوی" ہے اس کتاب پر قاضی محمد ولد قاضی محمد باقر کی ملکیت کی مہر ہے، اور معلوم نہیں کہاں سے جامعہ میں آگئی ہے، اس کا مصنف نومسلم ہندو ہے، اسکا پہلا نام ہرکشن تھا، اور اسلامی نام عبد القوی ہے، وہ سامانہ کا رہنے والا تھا، جو پنجاب میں ایک مقام ہے، مقدمہ میں وہ عالمگیر کا ذکر اور اس کتاب کی کیفیت اسطرح لکھتا ہے،

"بندہ فقیر حقیر عبد القوی ساکن سامانہ بخدمت اہل اسلام التماس می دارد کہ قبل ازیں نام فقیر ہرکشن بود، ایمان آورد بر دین حضرت رسالتپناہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہ حق است و کفر باطل، کفر را دستا، اسلام را حق شناختہ، نام خود را عبد القوی بنہاد ... شوال ۱۰۸۰ھ از دور خلافت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی، ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ کہ صدق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ و عدل حضرت عمر خطاب رضی اللہ عنہ، و حلم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ و شجاعت حضرت مرتضی علی کرم اللہ وجہہ خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ در خاطر رسید کہ مردمان کہ در کفر اند۔ (عبارت غلط ہے) رد کفر در قلم باید آورد تا کذب کفر و صدق اسلام معلوم گردد، و اگر مسلمان بخوانند سلامتی ایمان است، اگر کافر بخوانند در آنہا ایشان خدائے تعالیٰ خوب خواستہ باشد مسلمان شود، نام این کتاب ردّ الکفر بحجۃ القوی (مصنف کے نام کی تلمیح ہے) نہادہ شد، امید کہ این نسخہ کمترین بندگان بدست ہر مسلمان کہ برسد کیفیت این رسالہ منتشر گرداند سعادت دارین یابد بطرف دلائل و عقائد نظر کنند نہ بطرف املا و انشا نظر کنند، اگر خطا شدہ باشد اصلاح دہند، این نیز ثواب ایشان باشد"

اس رسالہ کی زبان معمولی ہے، ۲۹ حقیقتوں پر یہ کتاب مشتمل ہے، آخر سے کچھ ناتمام ہے، ہر حقیقت کے تحت میں ہندوؤں کے مختلف عقاید و رسوم کو لیکر اس کی تفصیل کی ہے، اور اسکی خرابیاں دکھائی ہیں اور اس کے مقابل میں اسلام کی خوبیاں بتائی ہیں،

بہرحال اگر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ایسے نومسلم ہندو ہوتے تھے تو کون کہہ سکتا ہے کہ عالمگیر کے زمانہ میں دلائل کے زور کے بجائے تلوار کے زور سے ہندوؤں کو مسلمان بنایا جاتا تھا،

غَزَّالی یا غَزَالی؟

از

جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جونا گڈھی مترجم طبقات الامم

امام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی (م ۵۰۵ھ) اسلام کے ان چند اکابر سلف میں ہیں جن کے وجود پر اسلامی دنیا کو ہمیشہ فخر و ناز رہیگا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان مشہور امام بزرگ کی نسبت غزالی کے بارہ میں علماء متقدمین و متاخرین میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے، یہ بحث کہ آپ کو غزّالی (بہ تشدید) کہنا چاہیئے یا غزالی (بہ تخفیف) امام کی وفات کے نصف صدی بعد ہی سے شروع ہوگئی تھی،

ایک فریق کا استدلال یہ ہے کہ چونکہ امام کے خاندان میں کوئی بزرگ ریسمان فروش تھے اس لئے ان کو غزّالی کہنے لگے، دوسرے فریق کی رائے میں غزالی منسوب بہ غزالہ ہے، جو ضلع طوس کے ایک قریہ کا نام ہے،

ہم یہاں ان دونوں فریقوں کے آراء نقل کرتے ہیں،

قائلین تشدید

علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں،

والغزالی بفتح الغین المعجمۃ وتشدید الزاء[1]	غزّالی غین معجمہ کے زبر اور زاء معجمہ کی تشدید کے ساتھ پھر الف
المعجمۃ وبعد الالف لام ھذہ النسبۃ	کے بعد لام، یہ نسبت ہے غزّال کی طرف اہل خوارزم و جرجان
الی الغزال علی عادۃ اھل خوارزم وجرجان	کے طریقہ پر جو قصاّ کو قصاری اور عطار کو عطاری کہتے ہیں، یہ
فانھم ینسبون الی القصاّ القصاری والی	بھی کہا جاتا ہے کہ یہ منسوب بہ غزالہ ہے، جو طوس کے دیہات میں سے
العطار العطاری وقیل ان الزاء مخففۃ نسبۃ	ایک قریہ ہے، اگرچہ یہ مشہور قول کے خلاف ہے، لیکن سمعانی نے
الی غزالۃ وھی قریۃ من قری طوس وھو	کتاب الانساب میں اسی طرح لکھا ہے، واللہ اعلم

[illegible]

[1] وفیات الاعیان ۱ × ۲۹

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ موصوف تشدید کو صحیح سمجھتے ہیں، اور کہ تخفیف کا قول غیر مشہور ہے،

(۲) مشہور مورخ ابن اثیر (م سنہ ۶۳۰ھ) غزّالی بالتشدید کو صحیح بتاتے ہیں،

ان الغزالی مخففاً خلاف المشهور وصوب فیه	غزالی بتخفیف زا مشہور قول کے خلاف ہے، اور اسکی تشدید ہی
التشدید وهو منسوب الی الغزال بائع الغزل	صحیح ہے جو منسوب غزّال ہے جسکے معنی ریسمان فروش کے
او الغزالی علی عادة اهل خوارزم وجرجان[1]،	ہیں، یا غزالی جیسا کہ خوارزم اور جرجان والے بولتے ہیں،

(۳) مورخ ابو الفداء (م سنہ ۷۳۲ھ) بھی اس امر میں ابن خلکان کے ہمزبان ہیں اور تشدید کے قائل[2]،

(۴) امام یافعی (م سنہ ۷۶۸ھ) نے امام غزالی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے، اس کا ایک شعر یہ ہے، جوان کے منسوب بہ غزّال ہونے پر دلالت کرتا ہے،

ابو حامد غزّال غزل من دق من العلم	ابو حامد غزالِ علم کو ایسا باریک کاتتے ہیں جو کسی تکلے
یغزل کذالك بمغزل[3]	سے کاتا نہیں جاسکتا،

(۵) شیخ آذری (م سنہ ۸۶۶ھ) نے جواہر الاسرار میں امام کی تاریخ وفات میں مندرجۂ ذیل اشعار نقل کئے ہیں،

"حجة الاسلام غزّالی بسال چار صد	با چل و پنج آمد از دوران گیتی در وجود
چون بسال پانصد و پنج از جہان رحلت نمو	سال عمرش بے گمانی شصت کم نشش و زبود"

ملک عماد زوزنی (م سنہ ۶۷۳ھ) درحق ایام گوید:-

بہ پرسیدم ز دانائے کہ ملک ملت احمد	درایامے کہ شد یکسر ز غوغائی ہوا خالی
بمن گفتا عجب حالی کہ میدانی دمی پرسی	بعہد علم غزّالی بعہد علم غزالی[4]،

[1] تاج العروس مادۂ "غزل" غالباً ابن اثیر کا یہ قول انکی کتاب اللباب فی معرفۃ الانساب سے ماخوذ ہے۔

[2] المختصر فی اخبار البشر ۲×۲۲۶ [3] مرآۃ الجنان ۲۰۴۸۲-۳×۱۸۷ میں بھی یہ شعر موجود ہے گو وہاں علم کی جگہ غزل ہے [4]

جواہر الاسرار قلمی ص ۲۰ موجودہ کتبخانۂ پیر محمد شاہ (؟) احمد آباد۔ اسی طرح کسی فارسی شاعر کا یہ شعر بھی تشدید کا مؤید ہے، ہر دبیر و شاعر و منطقی کہ او طوسی بود / چون نظام الملک و غزّالی و فردوسی بود

(۶) امام سیوطی (م سنہ ۹۱۱ھ) نے بھی لب اللباب[1] میں ہر دو اقوال نقل کرنے کے بعد تخفیف والے قول کی تضعیف کی ہے۔

(۷) علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی نے شرح احیار العلوم کے مقدمہ میں غزالی کی وجہ تسمیہ پر مختلف اقوال نقل کئے ہیں، اس بحث کے آخر میں وہ لکھتے ہیں۔

والمعتمد الاٰن عند المتأخرین من ائمة التاریخ	ہمارے زمانہ میں متاخرین ائمۂ تاریخ و انساب کے نزدیک
والانساب ان الحق ما (؟) ابن اثیر انه بالتشدید	ابن اثیر کا تشدید والا قول ہی زیادہ معتبر ہے،

آگے چل کر علامہ موصوف فرماتے ہیں، "میں نے اپنے شیخ سید عیدروس سے سنا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ خواب میں نبی صلے اللہ علیہ والہ وسلم کی زبان مبارک سے غزّالی کو بتشدید سنا ہے[2]،

قائلینِ تخفیف

ابن خلکان اور ان کے تتبع میں دوسرے مصنفین نے لکھا ہے، کہ سمعانی (م سنہ ۵۶۲ھ) تخفیف کے قائل ہیں اور غزالہ کو طوس کا ایک قریہ بتاتے ہیں[3]،

(۲) احمد بن محمد الفیّومی (م سنہ ۷۷۰ھ) لکھتے ہیں کہ "غزالہ طوس کا ایک قریہ ہے،" اور اسی کی طرف ابو حامد منسوب ہیں، مجھے اس بات کی اطلاع شیخ مجد الدین بن محمد بن محی الدین بن ابی طاہر شروانشاہ بن ابی الفضائل فخر آور بن عبد اللہ ابن ست النسا بنت ابی حامد الغزالی نے سنہ ۷۱۰ھ میں بغداد میں دی ہے، اور کہا کہ لوگوں نے ہمارے نانا کا نام بہ تشدید پڑھنے میں غلطی کی ہے، حالانکہ وہ قریہ غزالہ سے منسوب ہیں[4]،

[1] لب لباب فی تحریر الانساب ص ۱۸۶ لیڈن [2] اتحاف السادۃ المتقین فی شرح احیار علوم الدین ۱×۱۸

[3] اتحاف (یہاں جس خواب کا حوالہ دیا گیا ہے اسکی تفصیل اسی کتاب کے ص ۲۹ کے حاشیہ پر درج ہے کہ یہ خواب حضرت شیخ ابو الحسن شاذلی نے دیکھا تھا جسمیں آنحضرت صلعم نے حضرت عیسیٰ و موسیٰ علیہما السلام سے دریافت فرمایا کہ آیا انکی امت میں غزالی سا جید عالم کوئی گذرا ہے)

[4] وفیات الاعیان ۱×۲۹ [5] مصباح المنیر ص ۶۸۵ طبع میری،

(۳) **شیخ صلاح الدین صفدی** (م سنہ ۷۶۴ھ) کا بیان ہے کہ امام موصوف نے اپنی کسی تصنیف میں لکھا ہے، لوگ مجھے غزّال سے منسوب کرتے ہیں حالانکہ میری نسبت بتخفیف زا غزالہ سے ہے، جو طوس کے دیہات میں ایک قریہ ہے [1]

(۴) **محمد طاہر الفتنی**۔ (م سنہ ۹۸۶ھ) غزالی کو تشدید کے ساتھ ضبط کرنے کے بعد لکھتے ہیں،

وروی عن الغزالی انہ انکرها وقال انا انا الغزالی بخفة الزای نسبة الی غزالة قریة بطوس [2]،

غزالیؒ سے مروی ہے کہ انھوں نے تشدید کا انکار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ میں غزالی بتخفیف زائے ہوں منسوب بہ غزالہ جو طوس کا ایک قریہ ہے۔

(۵) یہی **علامہ مرتضیٰ بلگرامی** جو تشدید کے حامی ہیں اور جنکی رائے اوپر بیان ہو چکی تاج العروس میں غ زل کے مادہ میں لکھتے ہیں۔

وغزالة کسحابة قریة من قری طوس وقیل والیها ینسب ابو حامد کما صرح به النووی فی التبیان

غزالہ بروزن سحابہ طوس کے دیہات میں سے ایک قریہ ہے، کہتے ہیں کہ ابو حامد اسی سے منسوب ہیں جیسا کہ امام نووی نے تبیان میں تصریح کی ہے۔

تیسرا قول عام طور پر یہی دو قول مشہور ہیں، لیکن شہاب خفاجی (م سنہ ۱۰۶۹ھ) نے غزالی کو بہ تشدید ضبط کرنے کے بعد ایک تیسرا قول نقل کیا ہے،

وقیل نسب (الغزالی) لغزالة بنت کعب الاحبار [3]،

اور کہتے ہیں کہ وہ (غزالی) غزالہ بنت کعب الاحبار سے نسبت دیئے گئے ہیں۔

[1] مفتاح السعادۃ لطاش کبری زادہ ۲ × ۲۰۴
[2] المغنی فی اسماء رجال الحدیث ص ۶۰ طبع دہلی
[3] نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض لاحمد شہاب الدین الخفاجی ۴ × ۴۹۴ مصر سنہ ۱۳۲۷ھ

سید مرتضیٰ اس قول کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وهذا ان صح فلا محید عنه [1]، اگر یہ صحیح ہو تو پھر اسکو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے،

اوّل تو اس کے قائل کا پتہ نہیں ہے، نہ خفاجی نے کسی کتاب کا حوالہ دیا ہے، دوسرے امام کے سوانح نگاروں میں سے کسی نے نہیں لکھا کہ وہ کعب الاحبار کی صاحبزادی غزالہ کی اولاد سے تھے، پھر خفاجی اسمیں منفرد ہیں، لہذا تاریخی اہمیت کے اعتبار سے یہ قول قابلِ اعتنا نہیں ہو سکتا،

محاکمہ مندرجۂ بالا اقوال سے قارئین پر واضح ہوگا کہ عام رائے تشدید کے موافق اور تخفیف کے خلاف ہے۔ جیسا کہ علامہ شبلی مرحوم نے بھی الغزالی میں تحریر فرمایا ہے [2]، قائلین تخفیف کا تمام تر دارو مدار سمعانی پر ہے حالانکہ یہ ایک طرح کا مغالطہ ہے، اس لئے کہ کتاب الانساب میں سرے سے اس نسبت (غزالی) ہی کا ذکر نہیں ہے، البتہ جیسا کہ تغری بردی نے لکھا ہے [3]، سمعانی نے یہ قول خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد کے ذیل میں لکھا ہے، اصل واقعہ یہ ہے کہ ابن خلکان کے کسی قلمی نسخہ میں سمعانی کی یہ عبارت موجود نہ تھی، سوا اس نسخہ کے جو خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، ابن خلکان کا انگریزی مترجم لکھتا ہے [4] کہ اس نسخہ میں یہ عبارت اس طرح حاشیہ پر لکھی ہوئی ہے،

لکن هذا قاله السمعانی فی کتاب الانساب والله اعلم،

جو اصل متن میں غلط جگہ درج ہو گئی ہے، جیسا کہ سید مرتضیٰ کی عبارت ذیل سے معلوم ہوگا:۔

وقال الذهبی فی العبر وابن خلکان فی التاریخ عادة اهل خوارزم وجرجان یقولون القصاری والخبازی بالیاء

ذہبی نے عبر میں اور ابن خلکان نے تاریخ میں لکھا ہے کہ اہل خوارزم وجرجان قصار کو قصاری اور خباز کو خبازی یا کے ساتھ کہتے ہیں، اسی طرح وہ غزل کی جمع

[1] اتحاف السادۃ المتقین ۱ × ۱۸، [2] الغزالی ص ۱-۲، آسی پریس، [3] النجوم الزاہرہ ۲ × ۸۵ طبع یورپ،
[4] انگریزی ترجمہ ابن خلکان از ڈی سلین ۱ × ۸۰،

فیھما فنسبوہ للغزل وقالوا الغزالی ومثل ذالک الشجامی واشار ذالک ابن السمعانی ایضاً وانکر التخفیف وقال[1] سألت اھل طوس عن ھذہ القریۃ فانکروھا وزیادۃ ھذہ الیاء قالوا للتاکید[2]

سے غزالی کہنے لگے، اور ایسا ہی شجامی بھی ہی ابن سمعانی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، اور تخفیف زا سے انکار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے جب طوس والوں سے اس قریہ کی نسبت دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ اس نام کا کوئی قریہ نہیں ہے، اور بتایا کہ یا تاکید کیلئے بڑھاتے ہیں،

سید مرتضیٰ بھی ابن خلکان ہی کے حوالہ سے لکھ رہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان کے پیش نظر ابن خلکان کا جو قلمی نسخہ رہا ہوگا، اس میں سمعانی کی یہ عبارت اس طرح پر نہ تھی، کیوں کہ انھوں نے سمعانی کا جو قول نقل کیا ہے وہ بجائے موید ہونے کے تخفیف کا مخالف ہے[2]، پھر صرف یہ کہدینے سے کہ سمعانی نے اس کا ذکر کیا ہے، یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس کے قائل ہیں،

قائلین تشدید کی بڑی دلیل یہ ہے کہ طوس کے ضلع میں غزالہ کوئی گاؤں نہیں ہے، جغرافیہ کی اکثر مشہور و متداول کتابوں مثل معجم البلدان، کتاب الجبال والامکنۃ والمیاہ للزمخشری، اور ان تمام کتابوں میں جو سلسلہ Bibliotheca Geographorum Ara-bicorum میں شائع ہوچکی ہیں، کہیں اس قریہ غزالہ کا پتہ نہیں چل سکا، البتہ ایک فیتومی کی روایت ایسی ہے جو نظر انداز نہیں کیجا سکتی، لیکن وہ روایت کرتے ہیں امام کے نواسے سے جو ان کی صاحبزادی کی اولاد سے ساتویں پشت میں ہیں، اور جنکا زمانہ امام سے ۲۰۰ برس بعد ہے، ممکن ہے کہ یہ روایت ان کے خاندان میں چلی آتی ہو، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ غزالہ کی

[1] اتحاف السادۃ ۱ × ۱۸ [2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مضمون "غزالی" کے شروع میں بھی یہی لکھا ہے، کہ سمعانی تشدید کو ترجیح دیتے تھے،

"نسبت خود امام کے خاندان والوں کو مدت دراز کے بعد معلوم ہوئی ہو جبکہ اس قریہ کا نام و نشان مٹ چکا تھا؟ اور کیا یہ ہو سکتا ہے کہ سوائے بعض باخبر آدمیوں کے تمام خاندان والوں نے اس کو بھلا دیا ہو؟ اور پھر لوگ اس کو مشدد بولنے اور پڑھنے لگے ہوں؟

صلاح صفدی اور طاہر فتنی دونوں امام کے حوالہ سے لکھتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ ان کا ماخذ کیا ہے، اور کہ امام نے اپنی کون سی تصنیف میں یہ لکھا ہے،

امام کے علاوہ تین غزالی اور بھی ہیں، جنکا ذکر سبکی نے کیا ہے:-

(۱) علی بن معصوم بن ابی ذر ابوالحسن الغزالی المتوفی سنۃ ۴۹۶ھ[1]

(۲) عبدالباقی بن محمد عبدالواحد الفقیہ ابوالمنصور الغزالی المتوفی سنۃ ۵۱۳ھ[2]

(۳) العلاء علی بن احمد الغزالی صاحب میزان الاستقامۃ لاھل الکشف والکرامۃ المتوفی سنۃ ۷۲۱ھ[3]

یہ مان لینا مشکل ہے، کہ یہ سب کے سب طوس کے اسی گمنام اور مجہول الحال قریہ ہی سے نکلے ہوں گے، بہرحال اتنا تو ثابت ہے کہ امام کے خاندان کے بعض افراد کا پیشہ ریسمان فروشی تھا، جو منسوب بہ غزالہ ہونے کے باوجود بھی ان کو غزالی بہ تشدید کا لقب دے سکتا تھا، جیسا کہ طاشکبری زادہ نے لکھا ہے:-

ان والد الغزالی کان یغزل الصوف ویبیعہ بدکان بطوس وروی ایضا ان الغزالی حکی ان اباہ کان فقیراً صالحاً لا یاکل الا من کسب یدہ فی عمل غزل الصوف[5]

غزالی کے والد صوف کاتتے اور اس کو طوس کی ایک دکان پر بیچا کرتے تھے، خود غزالیؒ سے منقول ہے کہ ان کے والد ایک درویش صالح تھے اور صوف کاٹ کر صرف اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے،

[1] طبقات الشافعیہ ۴ × ۲۰۴ [2] ایضاً ۴ × ۲۴۲ [3] کشف الظنون ۲ × [5] مفتاح السعادۃ ۲ × ۱۹۲

سب سے بڑی اور زندہ شہادت جو تشدید کی موید ہے، وہ یہ ہے کہ اس وقت شہر طوس (طابران) کے باہر امام صاحب کے خاندان کے کسی بزرگ کی قبر موجود ہے، جس پر غزالی، بالتشدید کندہ ہے، اس کے متعلق ریورنڈ گارڈنر اپنی کتاب الغزالی میں لکھتے ہیں :-

"ریورنڈ ویری نے ازراہ مہربانی مجھے وہ دو خط دیکھنے کو دئیے ہیں جو مشہد (ایران) کے ریورنڈ ڈوائٹ ایم ڈونالڈسن نے ان کو لکھے تھے، ان خطوط میں شہر طوس (طابران) کے حالات درج ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے باہر اب تک ابو حامد (غزالی) کی قبر موجود ہے، ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو لیکن مجھے اس کی نسبت یقین نہیں ہے، کیونکہ سبکی نے (طبقات ۳×۳۵) ایک ابو حامد محمد بن محمد الغزالی کی قبر کا ذکر کیا ہے جو طوس کے باہر گورستان میں واقع ہے، وہ غزالی الماضی کے نام سے مشہور ہیں، غالباً وہ امام غزالی کے چچا یا ان کے دادا چچا ہیں، (اس قبر کے فوٹو کے لئے دیکھو زدمیر کی کتاب Islam at its Best)

مسٹر ڈونالڈسن اپنے دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ غزالی اس کتبہ میں تشدید کے ساتھ لکھا ہوا ہے، گو تشدید کی علامت بجائے ءء کے صرف ء ہے[1]،

مستشرقین کی راے پروفیسر براؤن (آنجہانی) پہلے ڈبل z سے لکھا کرتے تھے، لیکن نامور مستشرق "ذہبی" (Goldziher) کی تنبیہ پر وہ ایک z سے لکھنے لگے، تاہم وہ لکھتے ہیں :-

"بہر حال یہی (تشدید والا) رسم الخط مصنفین اسلام کے ہاں تیرہویں صدی عیسوی تک عام طور پر رائج تھا، (دیکھو الغزی ص ۱۸۱ مرتبہ اہلوردت)[2]"

[1] Algazali by The Revd W. R. W. Gardner M.A. P. 29
[2] A Literary History of Persia Vol I PP 293

پروفیسر رینالڈ، اے نکلسن بھی اپنے استاد کے مقلد ہیں، تاہم وہ قائلین تشدید کی جماعت کو بہترین جماعت بھی کہتے ہیں :-

"میں سمعانی کے تتبع میں غزالی کو ایک z کے ساتھ لکھتا ہوں، مگر وہ لوگ جو ڈبل z لکھتے ہیں تو وہ کم از کم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس غلطی میں ایک بہترین جماعت کا ساتھ دے رہے ہیں[1]"

کاش انھیں معلوم ہو جاتا کہ جس کو وہ سمعانی کا تتبع سمجھ رہے ہیں، وہ ایک طرح کا مغالطہ ہے، امریکن پروفیسر میکڈانلڈ نے اس نسبت پر ایک طویل نوٹ لکھا ہے جس میں ما لہ وما علیہ پر بحث کرنے کے بعد آخر میں وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں :-

"یہ اقوال کسی صحیح اور یقینی نتیجہ تک رہنمائی نہیں کرتے، اس لئے میں نے غزالی کو بہ تشدید ہی لکھنا شروع کیا ہے، جسے مشرق میں عام طور پر سند قبول حاصل ہے[2]"

[1] Literary History of The Arabs P.P 339
[2] J. R. A. S. Vol LIV. (1902 PP 18

انڈیا آفس لندن کی بعض دکھنی قلمی کتابوں

پر

ایک سرسری نظر

از

جناب محمد نصیر الدین صاحب ہاشمی - ایم اے (عثمانیہ) مؤلف "دکن میں اردو" مقیم لندن

اگر معارف یہ فخر کرے کہ انڈیا آفس لائبریری کے اردو ذخیرہ کا سب سے پہلے اسی نے پتہ لگایا اور ہندستان کی پبلک کو اس سے روشناس کیا تو بیجا نہ ہوگا - اڈیٹر معارف نے اپنے قیام لندن کے زمانہ ۱۹۲۰ء میں سب سے پہلے انڈیا آفس لائبریری کے اردو ذخیرہ کی تلاش کی اور اسکی مرتبہ فہرست سے فن وار اردو کتابوں کی فہرست بناکر معارف میں چھاپا، اسکے بعد جب وہاں کی اردو فہرست شایع ہوئی تو سب سے پہلے اسی نے فہرست کی غلطیوں کو آشکارا کیا۔

یہ واقعات لکھنے کی اسلئے ضرورت پیش آئی کہ ہمارے مضمون نگار دوست سے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ معارف ہی کے مضامین نے انکے دل میں انڈیا آفس کی اردو کتابوں کے ذاتی مطالعہ و تحقیق کی گدگدی پیدا کی،

ہاشمی صاحب جامعۂ عثمانیہ کے ان تعلیم یافتوں میں ہیں جن کی لیاقت و قابلیت اور علمی شوق و ذوق نے دوران تعلیم ہی میں خاص امتیاز حاصل کرلیا تھا، فراغت کے بعد انھوں نے "دکن میں اردو" کے نام سے دکن کے ابتدائی اردو ادب و شاعری کے دور کی تاریخ بڑی تحقیق سے مرتب کی، اہل علم اور ارباب فن نے اس کتاب کی بیحد تعریف کی اور اس کیلئے اعلیحضرت سرکار دکن نے ایک گران بہا انعام دینا چاہا مگر مصنف نے اپنے علمی شوق کا عملی ثبوت یہ دیا کہ نقد انعام کے بجائے یہ خواہش کی کہ اس مضمون کی مزید تحقیق و مطالعہ کیلئے انکو انگلستان بھیجا جائے۔ چنانچہ سرکار عالی نے اپنی قدردانی سے ان کی یہ درخواست قبول کی اور ایک سال کیلئے یورپ کا تعلیمی وظیفہ دیکر ان کو انگلستان روانہ کردیا، موصوف آج کل انگلستان میں مقیم ہیں اور اردو اور خصوصاً دکھنی اردو کی قلمی کتابوں کی تلاش و تحقیق میں مصروف ہیں اور اسی سلسلہ میں معارف کی مذکورۂ بالا حیثیت کو ملحوظ رکھکر ذیل کا مضمون بھیجا ہے جسکو ہم شکریہ کیساتھ شایع کرتے ہیں'

"معارف"

آج سے تقریباً دو ڈہائی سال قبل رسالہ معارف میں انڈیا آفس کی اردو کتابوں کی کیٹلاگ پر ریویو کیا گیا تھا' جس میں نہ صرف غلطیاں ظاہر کیگئی تھیں بلکہ اسکو اپنی نوعیت کے لحاظ سے نامکمل بتایا گیا تھا حال میں رسالہ "اردو" میں بھی اسکے متعلق ایک مضمون شایع ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں اردو خاص کر دکھنی کتابوں کا جو نایاب ذخیرہ موجود ہے اسکی کماحقہ تفصیل کیٹلاگ مذکور سے واضح نہیں ہوتی - اسمیں نہ صرف فروگذاشتیں ہوئی ہیں بلکہ انکی پوری صراحت و وضاحت بھی نہیں ہوتی ہے جس کے باعث بعض نایاب کتابوں کا حال جب تک کتبخانہ مذکور سے استفادہ حاصل نہ کریں معلوم نہیں ہوسکتا - اور نہ صرف انڈیا آفس (لندن) میں بلکہ برٹش میوزیم - رائل سوسائٹی وغیرہ کے علاوہ انگلستان کے دیگر شہروں اور پیرس - مارسلز - اور برلن کے کتب خانوں میں بھی دکھنی مواد موجود ہے جو سب دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے،

یورپ میں جو دکھنی مواد ہے اسکی پوری تفصیل تو یہاں نہیں ہوسکتی اور نہ اس کا یہ موقع ہے' یہاں میں چند کتابوں پر مختصر نوٹ پیش کرتا ہوں - یہ کتابیں جہاں تک میرا خیال ہے ہندوستان میں موجود نہیں ہیں کیوں کہ اب تک ان کے متعلق کسی نے بھی پوری صراحت نہیں کی ہے بلکہ صرف کیٹلاگوں سے استفادہ کرکے ان ہی کے معلومات کی بنیاد پر بعض قیاسی باتیں قایم کرلی گئی ہیں' اگر ان کتابوں کا وجود ہندوستان کے ذخیروں میں ہوتا تو جن قیاسی امور کا اظہار کیا گیا ہے اسکی ضرورت داعی نہ ہوتی -

یوں تو کوئی ایک کتابیں نادر کہی جاسکتی ہیں مگر اب تک جن سے میں نے استفادہ کیا ہے اور معلومات فراہم کئے ہیں' ان میں سے چند کی صراحت کیجاتی ہے۔

(۱) **مثنوی خاور نامہ دکھنی** ۔ اس کتاب کے متعلق جو معلومات ہندوستان میں حاصل ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ عہد عادل شاہی کی مثنوی ہے جسکو رستمی نے (اگر قیاس کیا گیا ہے کہ صحیح نام رستمی ہے) ۱۰۵۹؁ء میں ابن حسام کے فارسی خاور نامہ سے ترجمہ کیا ہے اور اسمیں حضرت علیؓ کے محاربات کا ذکر ہے ۔

ظاہر ہے کہ اس سے کتاب کی چنداں اہمیت واضح نہیں ہوتی مگر اب کتاب کے مطالعہ سے اسکی اہمیت ظاہر ہوتی ہے ۔ یہ مثنوی چند خاص خصوصیات رکھتی ہے، اول تو یہ کہ عہدِ عادل شاہی کی جتنی مثنویاں اب تک معلوم ہوئی ہیں ان تمام میں یہ سب سے قدیم ہے ۔ گلشنِ عشق ۔ علی نامہ وغیرہ سب اسکے بعد کی تصانیف ہیں، دوسرے یہ کہ یہ مثنوی حجم کے لحاظ سے اردو کی کل مثنویوں سے غالباً بڑی ہے، اس کے (۱۰۸۶) صفحے ہیں اور اشعار کی تعداد (۲۴۰۰۰) چوبیس ہزار بتائی گئی ہے، تیسرے یہ کہ یہ رزمیہ مثنوی ہے، اردو پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ اسمیں سوائے عشق و محبت کے اور کوئی مضمون نہیں ہے، اس مثنوی سے جو "شاہ نامہ" کا جواب کہی جا سکتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں بھی ابتدا ہی سے رزمیہ مثنویوں کی جانب توجہ کیگئی تھی ۔

اس کے مصنف کے تخلص کے متعلق رستمی خیال کیا گیا ہے، چنانچہ مولف اردوئے قدیم نے صراحت کی ہے " ایتھے نے اس کا تخلص رستمی لکھا ہے لیکن یہ غلط ہے" ایک اور مضمون میں جو رسالہ تجلی (جلد ۲ نمبر ۳) میں شایع ہوا ہے حسب ذیل صراحت ہوئی ہے ۔

" گارسان دی تاسی نے اپنے تذکرہ میں اس کا ذکر کیا ہے اور تخلص بھی رستمی بتایا ہے مگر مسٹر بلوم ہارٹ نے اسکو غلط قرار دیکر ان کا تخلص رستمی لکھا ہے ہمارے نزدیک موخر الذکر بیان ناقابلِ قبول ہے، رستمی کی ترکیب ہی ایسی نہیں معلوم ہوتی کہ کوئی شخص اسکو اپنا تخلص اختیار کرے " ۔

مگر اصل کتاب سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قیاس صحیح نہیں ہے، نہ صرف اس فارسی تحریر سے جو کتاب کے ساتھ بوقت تصنیف درج ہوئی ہے بلکہ اشعار میں جو تخلص آیا ہے اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ کمال خاں کا تخلص رستمی صحیح ہے، چنانچہ ذیل کے اشعار ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں ۔

کیا ترجمہ دکھنی ہور دلپذیر	بولیا معجزہ یو کمال خان دبیر
خلق کہتی ہیں مجھ کمال خاں دبیر	تخلص سو ہے رستمی بے نظیر

(ورق ۱۰۹ الف)

دی ادمے جو مستی ابھی مجھ مدام	کرے رستمی کون او عالی مقام

(ورق ۱۰۹ ب)

فارسی تحریر میں مذکور ہے :-

" بکمال خاں ابن اسمعیل خطاط خان دبیر کہ دبیر قدیم شش کرسی درگاہ عدالت پناہ است و بزرگانش بخطاب خطاط خاں نوازش یافتہ اند و طبع نقادش در فن شاعری مہارتے تمام دارد و در سلک نظم و نثر دُر ناسفتہ راسفتہ آرد و در اشعار تخلص خود رستمی کردہ در قصائد و غزلیات فارسی و دکھنی بلاغت از حد بردہ رسپانیدند (؟) رستمی حسب الفرمودہ ...." (ورق ۵۴۳ ب)

نفس مضمون کے متعلق کیٹلاگ کے مطالعہ سے یہی واضح ہوتا ہے کہ اسمیں حضرت علیؓ کی خلافت کی جنگوں کا ذکر ہوگا ۔ چنانچہ اسکے متعلق ایک انگریز پروفیسر صاحب کا بھی یہی خیال تھا مگر کتاب کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ امر بخوبی روشن ہو جاتا ہے کہ اس کو خلافت کی جنگوں اور حالات سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے بلکہ ایک فرضی داستان ہے جو داستان امیر حمزہ کے طرز پر لکھی گئی ہے جس کے ہیرو حضرت علیؓ ہیں ۔

اس کتاب کے متعلق میں نے تفصیل سے مضمون لکھا ہے ۔ یہاں اصل فارسی خاور نامۂ ابن حسام بھی موجود ہے ۔

(۲) **مثنوی قطب مشتری** ۔ اس مثنوی کا نام اور مصنف کا نام دونوں جو اہم چیزیں ہیں کیٹلاگ سے مفقود ہیں اور اسکی اہمیت بھی غیر ظاہر ہے، اسکے متعلق بھی کوئی مزید معلومات ہندوستان میں حاصل نہیں ہیں، بلکہ انھیں پر اکتفا کیا گیا ہے جس کو مصنفِ کیٹلاگ بلوم ہارٹ نے بیان کیا ہے ۔

اس کتاب کے دیکھنے سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس مثنوی کا نام "مثنوی قطب مشتری" ہے چنانچہ اسکی تائید میں ذیل کا شعر پیش کیا جاتا ہے ۔

قطب مشتری من جو بولیا کتاب — سو ہوئی جگ میں روشن جیوں آفتاب

(ورق)

علی ہذا اس کے مصنف کے متعلق کوئی صراحت کسی نے بھی اب تک نہیں کی ہے مگر خود کتاب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا مصنف وجہی ہے ۔ یہ وہی وجہی ہے جس نے سبرس کو نثر میں لکھا ہے ذیل کے اشعار سے اس کا تخلص ظاہر ہوتا ہے ۔

وجہی ترا ذہن جیوں برق ہے — تجھے ہور بعضیاں میں کئی فرق ہے

توں وجہی کھیا شعر کئی دھات کا — ہوا زیاست بجر تے مزابات کا

(ورق ۶۸ ب)

اس مثنوی سے جو قطب شاہی عہد کی معلوم شدہ مثنویوں میں پہلی کہی جا سکتی ہے (کیونکہ سنہ ۱۰۱۸ھ کی لکھی ہوئی ہے اور غواصی و ابن نشاطی وغیرہ کے تصانیف اسکے بعد کے ہیں) یہ معلوم ہوتا ہے کہ علانیہ ولی عہد سلطنت کو بحیثیت ہیرو اور عاشق کے پیش کیا جا سکتا تھا ۔ یہ مثنوی ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں تصنیف ہوئی ہے اور اس کا ہیرو ولی عہد سلطنت محمد قلی قطب شاہ ہے جس کا کلیات دکھنی سنہ ۱۰۲۵ھ میں مرتب ہوا ہے ۔

مثنوی کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غواصی اور وجہی کی نوک جھوک ہوا کرتی تھی اور اس سے پہلے غواصی کی کوئی تصنیف جو غالباً کسی کتاب کا ترجمہ تھا لکھی گئی تھی (افسوس ہے کہ غواصی کی اس تالیف کا اب تک پتہ نہیں چلا)

مثنوی کے تقریباً (۲۱۶۰) شعر ہیں کتاب (۶۴) ورق کی ہے نہ کہ (۵۸) ورق جیسا کہ کیٹلاگ میں درج ہے ۔ بہر حال یہ مثنوی بھی ایک بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ اس پر میرے عزیز دوست مولوی سید

غلام محی الدین صاحب قادری زور تفصیل سے نظر ڈال رہے ہیں اور ممکن ہے کہ قریب میں کوئی مضمون شائع کرائیں ۔

(۳) **مثنوی پھول بن** ۔ اگرچہ یہ کوئی نادر کتاب نہیں کہی جا سکتی کیونکہ ہندوستان میں اسکے کئی ایک نسخے موجود ہیں ، مگر انڈیا آفس کے نسخے میں جو امور ظاہر کرنے ہیں اور ان سے کیٹلاگ ساکت ہے وہ یہ ہیں کہ ابن نشاطی کی تصنیف کے ایک عرصہ بعد نواب عبد الحمید خاں قلعہ دار سدہوٹ کے زمانہ میں ابن جعفر نے اس کا اضافہ کیا ہے اور (۳۰۰) سے زیادہ شعر لکھے ہیں[۱]،

ابن جعفر کے نام وغیرہ کی صراحت ذیل کے اشعار سے ہو سکتی ہے ۔

محمد حمید جعفر زباں کھول — نچھل دریا سوں دلکی دربچن رول

(ورق ۹۰ ب)

ختم کر ابن جعفر کوش توں دہر — آتا ابن نشاطی کے بچن پر

(ورق ۱۳۰ الف)

ابن جعفر کا اضافہ ابن نشاطی کے ذیل کے شعر کے بعد ہوا ہے ۔

عدالت کار کہ اپنی سیس پر تاج — فراغت سوں سدا کرتا ہا دراج

(ورق ۹۸ ب)

اضافہ شدہ اشعار سیمبر کی شادی کے حالات پر مشتمل ہیں اس اضافہ کرنے کی صراحت بھی کتاب میں موجود ہے

[۱] عبد النبی خاں ۔ عبد المجید خاں ۔ عبد الحمید خاں وغیرہ سدہوٹ وغیرہ کے قلعہ دار تھے جو سلطنت عادل شاہی کی جانب سے مقرر ہوئے تھے ۔ مگر ان کی خود مختار کی سی حالت تھی ۔ یہ علم و فن کے قدر داں تھے ، ان کی زیر سرپرستی متعدد کتابیں دکھنی زبان میں لکھی گئیں ۔ ولی ویلوری جس نے روضۃ الشہدا وغیرہ لکھی ، انہیں کے دربار کا شاعر تھا ، قصیدہ بردہ کا ترجمہ محمد بن رضا نے کیا اور محمد حمید جعفر نے پھول بن کا اضافہ کیا ۔ اس طرح ان قلعہ داروں کے زمانہ میں اردو دکھنی کی خاصی خدمت سدہوٹ نے کی ہے ۔ انڈیا آفس میں روضۃ الشہدا اور قصیدہ بردہ بھی موجود ہیں ۔

چند اشعار حسب ذیل ہیں،

قصّے کون پھول بن کے دو سنے جب — بچارے یوں آپس دل میں انو تب

حکایت ہے سنبر کی بہوت خوب — سکل اس کا بیان ہے بہوت محبوب

دلی نہیں بھاؤ کا مذکور ہے کچ — نہ ہلدی تیل کا دستور ہے کچ

کچ اک شمہ سخن کا یچ منی پائی — سو یوں اس بھاؤ کا یچ حکم فرمائی

کرو کچ ذکر اس کی بھاؤ کا اب — لکھا دیں یو قصا تصویر سوں سب

کرے جب حکم سوں یوں یچ سرفراز — حکم پر میں کیا کچ سخن باز

(ورق ۱۲۹ ادب)

(۴) مثنوی پدماوت۔ اس مثنوی کے متعلق بھی کوئی وضاحت کیٹلاگ میں نہیں ہے اور نہ کسی اور نے اس پر کچھ روشنی ڈالی ہے، یہ مثنوی بھی نایاب کہی جاسکتی ہے۔

اولاً اسکو شیر شاہ سوری کے حکم سے ملک محمد جائسی نے ۹۴۷ھ میں بزبان بھاکا لکھا تھا جس کے بعد ۱۰۲۸ء میں جہانگیر کے عہد میں شیخ محمد بزمی نے اسکو فارسی نظم میں منتقل کیا اور اسکے بعد قطب شاہی سلطنت میں اس کا ترجمہ دکھنی نظم میں ہوا جسکو سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں غلام علی شاعر نے کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے غلام علی اشعار میں اپنا پورا نام ہی استعمال کیا کرتا تھا، چنانچہ اس مثنوی میں متعدد جگہ اس کا ذکر ہوا ہے۔ مثلاً ؎

غلام علی شاہ کا ہے غلام — جو کرتا ہے دائم دعا صبح و شام

غلام علی نا یچ کئے سو پند — پرے نا کھانی سیتی آڈ بند

غلام علی جس کو تیں ہے حیات — جیٔ حق کی توفیق سوں کوئی دہات

مثنوی میں سلطان کی مدح بھی کیگئی ہے جس کے اشعار حسب ذیل ہیں:۔

یو بعد از کردں میں ثنا چہار یار کا — شہی بوالحسن اولیا جاہ کا

کنگ شاہ اس کا عدالت دیکھت — ہوئے ست دیکہ عادل نبت

سخاوت میں مشہور جیوں آفتاب — کرم حق اتار یا ہے اودیکھے باب

ہر اک علم میں ہور بلاغت منی — نہیں کوئی ہمتا شجاعت منی

سزاوار اچھو اسکی تیں جم یو راج — مبارک اچھو سلطنت تخت و تاج

جہانگیر کے عہد میں جو منظوم فارسی کتاب مرتب ہوئی تھی وہ بھی نایاب ہے۔ نواب ضیار الدین احمد خاں نیر درخشاں نے اس کا خلاصہ فارسی نثر میں خود اپنے قلم سے کیا ہے جو برٹش میوزیم کے نمبر (۱۹۹۱ء۵) پر موجود ہے۔ تاریخ کتابت ۱۰ رجولائی ۱۸۵۰ء ہے۔ دلی دہلوی نے بھی بنام رتن و پدم اس کو دکھنی میں منظوم کیا ہے۔

(۵) مثنوی ظفر نامہ۔ اسکے متعلق بھی مکمل معلومات حاصل نہیں ہوتے۔ اکثر امور پردۂ اخفا میں ہیں، اسکو غلام علی خاں لطیف نے سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے زمانہ میں مرتب کیا ہے، اپنے متعلق انھوں نے صراحت کی ہے کہ خود سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے شاعر ہیں چنانچہ کہتا ہے:۔

ہوں سلطان عبداللہ کے دور کا — شجاع ہور سخا ہوں برے تور کا
طور

ورق (۱۵۶ ب)

اس مثنوی کو کب اور کہاں مرتب کیا گیا ہے، اس کے متعلق خود مصنف نے صراحت کی ہے چنانچہ کہتا ہے:۔

کہ فی الجملہ کر بولتا ہوں عیاں — مرتب کیا ہور کہاں سو بیاں

تھا جب دور سلطان شہ بوالحسن — شہر حیدر آباد ان کا وطن

کیا تب ظفر نامہ کا میں بناء — مرتب کئے لک سو تا جیب رھنا

محرم کا جب بدر پورا ہوا ظفر نامہ کاتب ظہورا ہوا .....

بنایوں کیا دن کمر باندرات مرتب سو عاشور کی چاندرات

ظفر نامہ یک سال میں سب کیا دہانتی ہر کیتن سو پرنے دیا

سنہ اکہزار و نود پانچ پتر (۱۰۹۵ھ) بنا کر مرتب کیا یو اچھر

(ورق ۱۵۶ ل)

انکو اپنی کتاب پر بڑا دعوی ہے، اسکو شاہنامہ فردوسی کے ہم پایہ بلکہ اس سے ممتاز خیال کرتے ہیں۔

ظفر نامہ شہنامہ کا تاج ہے رعیت ہے وہ یو راج ہے

کہ شہنامہ وصف اراجیف ہے ظفر نامہ مرداں کی تعریف ہے

ظفر نامہ مردان کا میدان ہے کہ شہنامہ گنبد ہے یو چوگان ہے

کیا کام ہاتھ کنگن کی تین آرسی دکن تسمیں عربی ہے ہو فارسی

توں دانا ہے تو ایک دانائی تے کہ بینا ہے تو دیکھ بینائی تے

ظفر نامہ میں کام کیا کیا ہوا ہے روشن دلاں کا یو روشن دیوا

(ورق ۱۵۵ ل)

(۶) قصۂ ابو شحمہ ۔ اس مثنوی کے متعلق بعض مضامین میں ظاہر کیا گیا ہے کہ بارہویں صدی ہجری کے اخیر زمانہ میں تصنیف ہوئی ہے اس لئے کوئی خاص اہمیت نہیں دیجاتی اور اسکے مصنف کے متعلق خیال کیا گیا ہے کہ امین ہے جس نے اول اس کو فارسی میں لکھا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مثنوی بارہویں صدی ہجری کے اخیر زمانہ کی نہیں ہے بلکہ قطب شاہی عہد میں تصنیف ہوئی ہے اور تاریخ تصنیف ۲۷ر رجب ۱۰۹۵ھ ہے جس کے ثبوت میں اشعار ذیل پیش کیے جاتے ہیں۔

حسن شاہ عبد اللہ آفاق گیر کہ ساری شہاں میں سو توں ہے کبیر

تمن میں گیاں دیتا ہے عالی نول خدا نے دیا تجہ معالی نضل

ترا نانوں شاہاں میں معمور ہے ترا گہر کہ ساریاں میں مشہور ہے

ہزار ایک برس ہور نود سال مین

رجب کی ستاویس دین رات مین

اس کا مصنف وہی امین نہیں ہے جس نے اس کو فارسی میں لکھا تھا بلکہ ایک جداگانہ شخص ہے۔ جس کے متعلق میں اپنی کتاب میں صراحت کروں گا۔

(۷) چندر بدن و مہیار ۔ اسکو بھی بارہویں صدی کی تصنیف خیال کیا گیا ہے حالانکہ یہ مثنوی بھی قطب شاہی عہد کی ہے، اس کے مصنف کا نام کیٹلاگ میں عزیز بتایا گیا ہے اور ہندوستان میں اسکو یقین کر لیا گیا ہے حالانکہ یہ عزیز کی تصنیف نہیں ہے بلکہ مقیمی کی تصنیف ہے، خود کتاب کے اشعار سے اس کی تائید ہو جاتی ہے، چنانچہ ملاحظہ ہو۔

بچن ایک نشانی کیا ناتمام رہی یادگاری قیامت مدام

دنیا تو فنا ہے مقیمی سہی رہیگی بچن کی نشانی سہی

مہر دہر مقیمی بچن پر صفا ز نعت محمد نبی مصطفی

(۸) جنگ نامہ ۔ اسکے متعلق رسالہ تجلی کے مضمون میں بتایا گیا ہے کہ یہ مرزا کی تصنیف ہے مگر اصل کتاب (انڈیا آفس) کے دیکھنے سے تو ظاہر ہے کہ یہ سیوک ہی کی تصنیف ہے۔ صاحب مضمون نے اس امر کو ثابت نہیں کیا ہے کہ مرزا خود کو سیوک کے لقب سے یاد کرتا تھا۔ بہت ممکن ہے مرزا کا جنگ نامہ محمد حنیف اور سیوک کا

جنگ نامہ دو علٰحدہ ہوں صاحب مضمون نے مرزا کا نمونہ کلام نہیں دیا ہے ورنہ کلام کا مقابلہ ہو سکتا تھا سیوک کے تخلص کے اشعار قابلِ ملاحظہ ہیں۔

حکایت انئی بچھر سیوک بولتا — براہیم اشتر کا جگ بولتا

(ورق ۷۶ ا)

یو سیوک تو، ہجری کری سال تہی — ہزار ایک نو دو د کی ایرال تھی
ای سیوک بنام رسول عجم — محمد حنیف شہ کا کر جنگ ختم

(ورق ۱۵۹ ب)

(۹) **دعائے فاطمہ** - ایک اور مثنوی ہے جس کے متعلق بھی کسی تفصیلی صراحت کا کیٹلاگ سے معلوم کرنا ناممکن ہے، اس مثنوی کے متعلق یہ خیال ہے کہ ولی دہلوی کی تصنیف ہے کیوں کہ ذیل کے اشعار سے اسی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

ولی کوئی سعادۃ کی کھر بار نین — خراباۃ میں روز و شب خور نین

ولی غم امت کا مشکل تمام
نہ اس غم میں رہا عقل ہوش و فام

لیکن ابھی کوئی قطعی رائے نہیں دیجا سکتی۔ مزید تحقیقات جاری ہے۔

(۱۰) **امواج خوبی (خوب ترنگ)** اس کو حسب بیان کیٹلاگ دکھنی زبان کی قدیم کتاب تصور کیا گیا ہے، حالانکہ یہ دکھنی نہیں ہے بلکہ گجراتی ہے۔ خود مصنف کے الفاظ بتو تا بیش ہیں۔

"مثنوی متن بزبان گجراتی است ترجمہ شرح معنائی آں مثنوی بہ زبان فارسی خواہد گفت این مثنوی گجراتی را خطاب خوب ترنگ دادم"

(۱۱) **مثنوی عشق صادق** ضعیفی کی تصنیف ہے، اس کو نامکمل تصور کیا گیا ہے حالانکہ مکمل ہے جس کے اشعار کی تعداد تقریباً (۲۴۰) ہے۔

یہ ایک مختصر صراحت ان کتابوں کی ہے جو اب تک دیکھی گئی ہیں۔ یہاں برٹش میوزیم لندن کی چند کتابوں کا ذکر کرنا بھی غالباً نامناسب نہ ہوگا، یہاں کے کیٹلاگ میں بھی فروگذاشتیں تھیں جن پر ایک علٰحدہ مضمون لکھا گیا ہے، یہاں کے مخطوطوں میں قابلِ ذکر بہرام کے متعلق تین مثنویاں ہیں جن پر میرے لایق دوست مولوی سید غلام محی الدین صاحب قادری زور نے تفصیل سے مضمون لکھا ہے اور جو شایع بھی ہو چکا ہے۔

دوسری قابلِ ذکر کتابیں "طوطی نامے" ہیں جن میں دو نظم میں غواصی کے ہیں اور ایک نثر میں ہے یہاں فارسی طوطی نامے نخشبی - ابوالفضل اور محمد قادری کے بھی موجود ہیں، دکھنی نثر کا طوطی نامہ ابوالفضل کے طوطی نامہ کا ترجمہ ہے۔ اسکے مصنف کے متعلق تحقیقات جاری ہے۔

ایک اور کتاب "جنگ نامہ حیدر" مصنفہ محمد اشرف ہے جس کے متعلق قیاس کیا گیا ہے کہ حضرت علی کی خلافت کے کارنامے ہیں۔ حالانکہ اس سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ یہ بھی ایک فرضی داستان ہے جو مغلیہ دور میں تصنیف ہوئی ہے۔

الحاصل یورپ کے کتب خانوں میں قیاس سے زیادہ سواد ہے، اڈنبرا میں تو بیسوں شاعروں کے مرثیے محفوظ ہیں جن پر آیندہ کام ہوگا۔

اسی ضمن میں یہ امر بھی غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ حال میں جو مضمون "رسالہ اردو" میں شایع ہوا ہے اسمیں انگریزی ترجمہ پر پوری توجہ نہیں کیگئی ہے۔ چنانچہ نصرتی کے گلشنِ عشق (نمبر ۱۰۶) کے متعلق حسب ذیل صراحت ہوئی ہے۔

نسخہ ثالث (۲۰۱ تا ۳۳۶) ورق آخر میں ایک نظم مدح علی عادل شاہ میں بزبان دکھنی شیخ میران انصاری کی لکھی ہوئی ہے۔ (رسالہ اردو صفحہ ۶۶۰)

کیٹلاگ کی اصل عبارت اور اس کا ترجمہ اس طرح ہوگا۔

اسی کا ایک اور نسخہ جس میں علی عادل شاہ کے مدحیہ اشعار نہیں ہیں، یہ شیخ میران انصاری کی لکھی ہوئی ہے۔	Another Copy of the same, without the poem in praise of Ali Adil shah, written by shaikh Miran Ansari

P. 57.

اصل کتاب کو دیکھنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کیونکہ اسمیں علی عادل کے مدحیہ اشعار نہیں ہیں اور کتاب شیخ میران انصاری کی لکھی ہوئی ہے اور نیز جو کتابیں دکھنی نہیں ہیں انکو دکھنی بتایا گیا ہے۔

فی الحال ان چند معلومات پر اکتفا کیا جاتا ہے، امید ہے کہ آیندہ کوئی اور اضافے کیے جائیں۔

مقالاتِ شبلی

مولانا کے مختلف مضامین کا دوسرا مجموعہ جس میں بعض علمائے اسلام کے سوانح، ہندوستان میں مسلمانوں کا تمدن، علامہ ابن تیمیہ، ابن حزم، اور قاضی ابن رشد کے حالات درس نظامی کی تاریخ وغیرہ مضامین ہیں،

ضخامت:- ۱۲۰ صفحے

قیمت: عہ

"منیجر"

کینٹ کے سوانح حیات اور اُس کے فلسفہ کی اہمیت

مرتبہ پروفیسر یوسف سلیم مرے کالج سیالکوٹ

(۲)

کینٹ ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہے جنکی شہرت و عزت ان کی زندگی ہی میں ہوجاتی ہے، اگر ایک طرف اس کی تندرستی گھٹ رہی تھی تو اس کے مقابلہ میں شہرت بڑھ رہی تھی، سنہ ۱۷۹۰ء میں اسکی تصنیف مذکور تمام درسگاہوں میں بطور نصاب فلسفہ پڑھائی جانے لگی اور بڑے بڑے عالم دور دراز مقامات سے بغرض استفادہ اسکے پاس آنے لگے، ان نامور لوگوں میں سے پہلا شخص جے جی فکٹے تھا، جو آیندہ زندگی میں خود بہت بڑا فلاسفر گذرا ہے، کینٹ کی بدولت، کونگزبرگ یونیورسٹی کی شہرت کو بھی چار چاند لگ گئے تمام یورپ میں اس یونیورسٹی اور اسکے فاضل روزگار پروفیسر کا چرچا ہوگیا،

اسی سلسلہ میں چند باتیں کینٹ کی خانگی زندگی کے متعلق بھی سن لیجئے، اسکی زندگی بیحد سادہ اور تکلفات سے بری تھی جیسا وہ نازک دماغ تھا، اس سے بڑھ کر نازک مزاج اور ضابطہ کا پابند، چونکہ نحیف، قصیر القامت اور جسمانی طور پر کمزور تھا، اسلئے بڑی احتیاط اور پابندی کی زندگی بسر کرتا تھا، گویا پرہیزی کھانا کھاتا تھا، پیدایشی طور پر اس کا سینہ تنگ تھا، اور پھیپھڑے کمزور، لیکن پرہیز اور احتیاط کی بدولت اسی سال تک جیتا رہا اور ۷۶ سال کی عمر تک کبھی کسی مرض میں مبتلا نہ ہوا، سچ تو یہ ہے کہ ہزار دوائیں ایک طرف اور محض احتیاط و پرہیز ایک طرف، تمام عمر شادی نہ کی، اسلئے نہیں کہ اسے فرقہ اناث سے نفرت تھی، یا اسکے سینے میں دل کی جگہ فولاد کا ٹکڑا رکھا ہوا تھا، بلکہ محض اسلئے کہ متاہل زندگی مطالعہ میں حارج ہوسکتی ہے، دو مرتبہ شادی کا ارادہ بھی کیا،

لیکن آدمی تھا سمجھدار اور عاقبت اندیش، کچھ سوچکر چپکا ہو رہا، وہ شاپن ہار کی طرح عزلت پسند اور مراقی
انسان نہ تھا، جب موقع ملتا شہر کے عمائد سے ملتا جلتا، سوسائٹیوں، کلبوں، جلسوں اور دعوتوں وغیرہ میں
برابر شرکت کرتا تھا اور وہاں اپنی خداداد ذہانت، بذلہ سنجی اور ظرافت طبع سے ہر کہ و مہ کو محظوظ کیا کرتا
تھا۔ فلسفی ہونے کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ آدمی بالکل خاموش اور گوشہ نشین ہو جائے، کرٹیک کی اشاعت
کے بعد اسے خیال پیدا ہوا کہ مجھے ایک گھر خرید لینا چاہئے، کیونکہ دور دراز سے لوگ ملنے کیلئے آتے ہیں، پس
۱۷۸۳ء میں اسنے ایک مختصر سا مکان خرید لیا، اور اپنا اثاث البیت جو تمام تر کتابوں پر مشتمل تھا قرینہ سے
اسمیں سجا دیا، ایک باورچی دوسرا خدمتگار تیسرے خود، بس انھیں تین نفوس پر گھر کی رونق کا انحصار تھا،
کینٹ کی عادت تھی کہ دوپہر کھانے پر ایک یا دو مہمان ضرور ہوں، عموماً سمجھدار طلبہ میں سے ایک یا دو کو مدعو
کیا جاتا تھا کبھی کبھی چار یا پانچ تک تعداد پہونچ جاتی تھی، دو تین طلبہ، دو تین علمدوست پروفیسر یا دوسرے
ملاقاتی،

اس کا دستور العمل تھا کہ صبح کو پانچ بجے اٹھتا، ۸ بجے تک مطالعہ کرتا، ایک گھنٹہ درس دینے کے بعد ۹ بجے
ناشتہ پھر ۹ بجے سے ایک بجے دن تک درس و تدریس، ایک بجے کے بعد کھانے پر بیٹھتا، دو ڈھائی گھنٹے کم از کم
کھانے میں صرف ہوتے، ایک نوالہ کھایا، ایک لطیفہ کہدیا، باتیں، لطیفے، ظرافت، بحث مباحثہ، تبادلۂ خیالات
غرض سب کچھ اسی دوران میں ہوتا تھا، چار بجے ہواخوری کیلئے قریب کے باغ میں چلا جاتا، پانچ بجے واپس آتا،
۱۰ بجے رات تک مطالعہ میں مصروف رہتا، سوتے وقت کوئی ہلکی غذا مثلاً دودھ یا شوربا ایک پیالہ پی کر
سات گھنٹے دل و دماغ کو آرام دیتا، پابندی کا یہ عالم تھا کہ آندھی آجائے، مینہ برس جائے ٹھیک چار بجے
سیر کو جاتا اور پانچ بجے واپس آجاتا، اکثر اوقات لوگ اسکی آمد و رفت سے اپنی پرانی گھڑیوں کا وقت ٹھیک
کر لیا کرتے تھے، شاید کبھی دس پندرہ سال میں کوئی واقعہ ایسا ہو جاتا ہو جو اسے اپنے مقررہ پروگرام میں تبدیلی
کرنے کی ضرورت پیش آتی ہو، نے غم دزد نہ غم کالا، کسی قسم کا سفر کرنے سے کینٹ کو دلی نفرت تھی، جسکا ثبوت

ناظرین کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں، زندگی کے آخری پندرہ بیس سالوں میں وہ شہر سے بھی باہر نہیں گیا،
ستم ظریفی ملاحظہ ہو، جو شخص جغرافیہ طبعی کا لکچرار مقرر ہوا ہو، اسنے نہ کبھی پہاڑ کی صورت دیکھی، نہ سمندر کی،
خیر پہاڑ تو کونگز برگ سے بہت دور ہے لیکن سمندر تو چند میل کے فاصلہ پر ہے، مگر کینٹ نے مدت العمر سمندر کی
شکل بھی نہ دیکھی، محض اس سبب سے کہ وہاں جانے کی کوئی ضرورت پیش نہ آئی اور بلا وجہ کہیں جانا اس کے
مذہب میں کفر تھا، لیکن کتابیں اس قصور کی تلافی کر دیتی تھیں، اپنے کمرہ میں بیٹھکر اگر ایک وقت وہ ارسطو اور
افلاطون سے باتیں کرتا تھا تو دوسرے وقت امریکہ اور ایشیا کے حالات پڑھا کرتا تھا، سیر اور سفر ناموں کے
مطالعہ سے اسے بڑی دلچسپی تھی، جب فلسفہ کی موشگافیوں سے اکتا جاتا تو کوئی سیرت کی کتاب لے بیٹھتا، اور
دل بہلا لیتا تھا، اسکے شاگرد کراس کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ بھی اسکی عادت تھی کہ جب وہ فلسفہ کی کوئی
کتاب تصنیف کرتا تو کوئی جدید شایع شدہ کتاب برابر میز پر رکھ لیتا، چند صفحے تصنیف کر لئے، وہ کتاب
اٹھالی اور تھوڑی دیر کے لیے دل بہلا لیا، ادبیات میں اسے ظرافت اور طنز آمیز تحریروں سے طبعی دلچسپی تھی،
یوں سمجھئے کہ اکبر الہ آبادی اور میر سجاد حسین کی تحریروں کا بڑا شایق تھا، ادب میں عموماً سوئفٹ، لیک ٹن برگ،
اور مان ٹین کی تصانیف زیر مطالعہ رہا کرتی تھیں، عاشقانہ فسانوں اور رقت انگیز ڈراموں سے بڑی نفرت تھی،
یوں سمجھئے کہ شرر کے ناولوں میں آسے ملک العزیز ورجینا تو پسند تھی لیکن منصور و موہنا ناپسند، کامیڈی کا تو
شائق تھا اور ٹریجیڈی سے نفور تھا،

کینٹ کے سوانح نگار لازمی طور پر عیسائی ہیں، لہذا ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا، جب وہ یہ کہتے ہیں کہ "وہ کلیسا
کی خدمات کا تو معترف تھا کہ اسکی بدولت عامۃ الناس میں اخلاقی زندگی پیدا ہوتی ہے، لیکن اسکی ذاتی روحانی یا عقلی
ضروریات گرجا یا کلیسا پوری نہ کر سکتا تھا، اسی لئے وہ کبھی گرجہ میں عبادت کے لئے نہیں جاتا تھا" اگر کینٹ کے سوانح
نگار غیر متعصب اور حق پسند لوگ ہوتے تو وہ یوں لکھتے کہ کلیسا کے عقاید خصوصی مثلاً خدا تین بھی ہے ایک بھی،
انسان کی نجات کیلئے اقنوم ثانی یعنی ابن بشکل انسان دنیا میں آیا، اور بقول پولوس اسنے جملہ خواص و صفات

الٰہیہ سے اپنی ہستی کو معرا کرلیا، اور انسانوں کی روحانی ترقی اس اعتقاد پر منحصر ہے کہ وہ "خدا" ہمارے لئے مصلوب ہوا، خدا بقول مشایخ کلیسا کلی ہے اور آب و ابن و روح القدس افراد ہیں، خدا پر تغیر بھی وارد ہوسکتا ہے، وہ صفات الٰہیہ کو ترک بھی کرسکتا ہے، یعنی واجب الوجود، ممکن ہوسکتا ہے، انسان ماں کے پیٹ ہی سے گنہگار پیدا ہوتا ہے، عشاء ربانی میں جب پادری شراب اور روٹی شرکاء میں تقسیم کرتا ہے تو حلق سے اترتے ہی وہ روٹی اور گوشت مسیح ناصری کے خون اور گوشت میں مبدل ہوجاتا ہے، غرض کلیسا کے معتقدات خصوصی کینٹ جیسے فلاسفر کی سمجھ سے باہر تھے، اسلئے وہ مسیحیت اور اسکے جملہ لوازم سے بکلی دست بردار تھا۔

لیکن کیسا مبارک اور پیارا مذہب ہم مسلمانوں کا ہے جسے خدا بھی پسند کرتا ہے چنانچہ وہ فرماتا ہے "ان الدین عند اللہ الاسلام" یعنی اللہ کے نزدیک بہترین مذہب اسلام ہے، ایک مسلمان خواہ کتنا ہی بڑا فلاسفر کیوں نہ ہوجائے لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ یا اس کے پاک کلام یا اس کے برگزیدہ رسول سے کوئی علاقہ نہیں یا مجھے اسلام کی ضرورت نہیں، مثلاً اسلام کی تاریخ پر نظر ڈالئے کیا امام رازی، امام غزالی، امام ابن تیمیہ، علامہ ابن رشد، ابن سینا، اسحاق الکندی، ابونصر فارابی وغیرہم کی یہ جرأت ہوسکتی تھی کہ وہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے اسوۂ حسنہ سے بے نیازی ظاہر کرتے، یا حضور انور کی عظمت و شان کا انکار کرتے یا اللہ تبارک وتعالیٰ کے متعلق جو بصیرت افزا اور عقل کو جلا دینے والی تعلیم قرآن پاک میں موجود ہے، اس پر کوئی اعتراض کرتے، یا اسلام سے رشتہ قطع کرکے اور اپنے فلسفہ پر تکیہ کرتے؟

کیا طرفہ تماشا ہے کہ ایک شخص جس قدر عقل سے کام لیگا، اسی قدر کلیسا کے معتقدات سے بیزار ہوگا، اور اسلام سے قریب ہوگا یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو انسان کا فطری مذہب بیان کیا،

فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ

کینٹ کے سوانح نگار آگے چل کر لکھتے ہیں کہ وہ "سچی عیسائیت کی عزت کرتا تھا، اور اسکے بانی کو بنی نوع آدم کا محسن سمجھتا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ سچی عیسائیت یہ نہیں ہے، جو آج کل گرجوں اور کلیساؤں

میں جلوہ فرمائی کر رہی ہے، وہ سچی عیسائیت کیا ہے، اس کا نقشہ بھی قرآن شریف نے کھینچ دیا ہے، اور اس کے بانی کا صحیح مرتبہ بھی بیان کردیا ہے، ملاحظہ ہو۔

ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل وامہ صدیقہ" الخ	مریم کا بیٹا مسیح صرف ایک پیغمبر تھا اس سے پہلے اور بہت پیغمبر گزر چکے اور اس کی ماں راستباز تھی،
لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلاثہ	جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے وہ کفر کرتے ہیں،
لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ؛	ایک کے گناہ کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا،

شائقین موازنہ مذاہب مزید واقفیت کیلئے قرآن پاک کی طرف رجوع فرمالیں،

اب ہم کینٹ کے عالم ضعیفی کے ایک اہم واقعہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جس کی تفصیل یوں ہے کہ ۱۷۹۴ء میں اس نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی، جس کا نام "مذہب بقید عقل خالص تھا" حکومت اسکے فلسفہ سے پہلے ہی بیزار تھی، کیونکہ وہ جنگ اور خونریزی کو بیحد ناپسند کرتا تھا، اور یہ باتیں حکومت کے مفاد کے منافی تھیں، کیونکہ پروشیا کا بادشاہ فریڈرک ثانی رات دن ملک گیری کے منصوبے باندھا کرتا تھا، اب جو کینٹ نے مروجہ عیسائی مذہب کے خلاف زہر افشانی کی تو حکومت کو کینٹ کی زبان بندی کا زریں موقع ہاتھ لگ گیا۔ کتاب کے مضامین کو جانے دیجئے اس کا نام ہی بتا رہا ہے کہ عیسائیت کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا ہوگا، کیونکہ کلیسا کا مذہب سراسر عقل کے قیود سے آزاد ہے، اس کتاب کی اشاعت کے چند ماہ بعد یکم اکتوبر ۱۷۹۴ء کو ملکی وزارت کی طرف سے ایک باضابطہ مراسلہ کینٹ کے پاس پہونچا، جسمیں یہ لکھا تھا "حکومت عالیہ نے آپکی کتاب کو بیحد ناپسند کیا ہے اور اسکی رائے میں آپ نے اپنے فلسفہ کا بیجا استعمال کیا ہے، کیونکہ اسکی رو سے مقدس بائبل اور مذہب عیسوی کے معتقدات کو زبردست نقصان پہونچا ہے، بلکہ اسکی بنیاد جڑ سے ہل گئی ہے، لہٰذا ہم آپ سے جواب طلب کرتے ہیں، یعنی آپ صفائی پیش کریں، اور حکم دیتے ہیں کہ آیندہ ایسی تحریرات سے قطعاً احتراز کیا جائے، جن سے مذہب عیسوی پر زد پڑتی ہو، اگر آپ نے اس حکم کی خلاف ورزی کی تو اپنی نافرمانی کے

نتایج بھگتنے کے لئے تیار ہو جایئے"۔ کینٹ بیچارے کے لئے یہ مرحلہ ایسا ہی تھا جیسا مرزا غلام احمد قادیانی کیلئے ڈپٹی کمشنر گورداسپور (پنجاب) کا عتاب نامہ، ہمارے بوڑھے فلاسفر نے بڑا لمبا چوڑا معافی نامہ لکھا جسمیں اپنی صفائی پیش کی اور اگرچہ دبے لفظوں میں یہ لکھدیا کہ ایک فلاسفر کو اظہارِ خیالات کی آزادی ملنی ضرور ہے، لیکن آخر میں یہ بھی لکھا کہ بحیثیت ایک وفادار رعایا ہونے کے میں حکومت کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ آیندہ مذہب عیسوی پر اظہارِ خیالات کرنے سے محترز رہونگا"۔

اسکی پرائیوٹ ڈائری میں اس واقعہ کے متعلق یہ الفاظ بھی دستیاب ہوئے کہ "حکومت سے برسرِ جنگ ہونا ایک شہری کیلئے مناسب نہیں۔ ممکن ہے کہ جو کچھ کسی نے کہا ہو وہ سچ ہو لیکن اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ شخص اس صداقت کو بیان کرنے کے لئے مجبور ہے' سچی بات کا اعلان کرنا انسان کے فرائض میں داخل نہیں" میں چاہتا ہوں کہ کینٹ اور فلسفہ کے شیدائی ذرا ٹھنڈے دل سے اس کے ان الفاظ پر غور کریں' اگر سچی بات یا کسی صداقت کا اعلان کرنا انسان کا فرض نہیں تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا اور فرض کیا ہے؟ یا پھر صداقت کا اعلان کرنا اور کس کا فرض ہے؟ کیا صداقت کا اعلان کرنا بہائم اور طیور کا فرض قرار دیا جائیگا؟ مقابلہ کیجئے کینٹ کی زندگی اور اسکے فلسفیانہ دماغ کا اسلام کے بیشمار خادموں کی زندگی کے ساتھ، تب آپ کو معلوم ہوگا کہ زندگی بخش اور جرات آفرین علم قرآن سے حاصل ہوتا ہے یا فلسفہ سے، کاش کینٹ کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا یہ حیات افروز قول معلوم ہوتا کہ "سلطان جابر کے سامنے حق و صداقت کا اعلان کرنا سب سے بڑا جہاد اور انسان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے" سچ ہے جو علم ہمارے اندر جرات ایمانی پیدا نہیں کرسکتا اس سے جہالت بہتر ہے۔ ناظرین کینٹ کے مذکورہ بالا قول کے ساتھ ذرا حجۃ الاسلام امام ابن تیمیہ کے طرزِ عمل کا مقابلہ کریں' امام احمد ابن حنبلؒ کی روش کا موازنہ کریں' قید خانے گئے، کوڑے کھائے، ذلت برداشت کی، مگر صداقت کے اعلان سے باز نہ آئے۔ خیر انھیں جانے دو، سقراط کی زندگی پر غور کرو، اس پر بھی یہی الزام عاید کیا گیا تھا کہ وہ اپنی تقریروں سے نوجوانوں کے معتقدات مذہبی کو

کو بگاڑتا ہے لیکن اس نے زہر کا پیالہ پینا قبول کیا مگر کتمانِ حق گوارا نہ کیا، پس اسمیں کوئی شک نہیں کہ کینٹ کا خمیر اس گوہر گرانمایہ سے تیار نہیں کیا گیا تھا جس سے سقراط یا ابن تیمیہ کا، اگر اس تہدید کے جواب میں وہ یہ لکھدیتا کہ مجھے پروفیسری کی پرواہ نہیں، حکومت کا ڈر نہیں' میرا مقصدِ زندگی اعلانِ صداقت ہے تو یقیناً آج اس کا نام زیادہ عزت کا مستحق ہوتا۔

لیکن اسمیں شک نہیں کہ اس تہدید اور زبان بندی کا کینٹ کے دل و دماغ پر بہت بڑا اثر پڑا، اور ۱۷۹۹ء میں اسکی صحت اور دماغی قوتیں اسقدر کمزور ہوگئیں کہ اسنے درس و تدریس سے ہاتھ اٹھا لیا' زندگی کے باقی ماندہ پانچ سال نہایت خاموشی کے ساتھ گذرے، اس دوران میں کینٹ اگرچہ گلے اور سینے کے امراض میں مبتلا رہا، لیکن پھر بھی حسبِ دستور قدیم اپنی میز پر بیٹھا مطالعہ میں مصروف رہتا، آخر کار ۱۲ فروری ۱۸۰۴ء کو ضعیفی کے عواقب اور مصایب کا ذائقہ چکھنے کے بعد راہی ملکِ عدم ہوا۔ آخری الفاظ جو اسکے مُنہ سے نکلے یہ تھے "یہ اچھی بات ہے"

یونیورسٹی نے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اس کا جنازہ اٹھایا' اور شہر کے بڑے گرجے میں سپردِ خاک کیا، اسکی قبر پر یہ الفاظ کندہ کئے گئے جو اسکی مشہور کتاب "تنقید عقل عملی" سے ماخوذ ہیں۔

"تاروں بھرا آسمان جو میرے سر پر ہے اور ضمیر کی آواز جو میرے اندر ہے"

یعنی انسان کو خدا کا علم ان دو چیزوں سے ہوتا ہے، ایک آفاق اور اس کا نظام دوسرے ضمیر اور اس کا قانون، قرآن شریف میں بھی اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان دو حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی ہے انسانوں کو لازم ہے کہ اپنے نفسوں میں غور کریں کہ دل کے اندر سے کیا آواز آتی ہے' اور یہ کہ ہر انسان کو ضمیر عطا کیا گیا ہے' اسکی آواز سنیں، اخلاقی قانون کی پابندی کا احساس ہر شخص میں ہے وہ کہاں سے آیا، اور پھر اپنی گرد و پیش کی چیزوں یعنی آسمان، زمین، سمندر پر غور کریں، سورج اور چاند پر غور کریں' انھیں حقایق کا فلسفیانہ نام دلائل انفسی و آفاقی ہے، بہرکیف یہ دو باتیں کینٹ کے رجحانِ طبیع کو بخوبی ظاہر

کرتی ہیں، یہ عالم جو منظم اور مرتب ہے وہ حقیقت تھی جس کی طرف جوانی میں کینٹ کی توجہ مبذول ہوئی اور [illegible] یعنی ضابطۂ اخلاق وہ حقیقت تھی جس نے اسکے عالم ضعیفی میں بھی اسے جوانوں کا سا جوش عطا کیا تھا۔ اب ہم اسکی شخصیت کے متعلق چند باتیں بیان کریں گے۔

۸ر اپریل ۱۷۶۶ء کو کینٹ نے اپنے دوست مینڈل سان کو ایک خط میں لکھا تھا "میرا دماغ غور وفکر کے دوران میں اکثر اوقات ایسے حقایق کا انکشاف کرتا ہے، جن کی صحت وصداقت کے متعلق مجھے یقین کلی حاصل ہوتا ہے، لیکن ان کے اظہار کی جرأت میں اپنے اندر نہیں پاتا، تاہم یہ اطمینان رکھو کہ میں وہ بات کبھی بھی اپنے منہ سے نہ نکالوں گا جس کے صحیح ہونے کا مجھے یقین نہ ہوگا۔ ...."

یہ خط بہت طویل ہے اور اسکو پڑھ کر ہم قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کینٹ راسخ العزم انسان تھا، مگر اسکی طبیعت اور مزاج میں پختگی نہ تھی، جیسا کہ اس کے قول سے مترشح ہوتا ہے، اس کا ارادہ آہنی سہی لیکن اسکی فطرت (نیچر) مضبوط اور فولادی نہ تھی، وہ تابِ مقاومت نہ لاسکتا تھا، اختلافات، مجادلہ اور مقابلہ وغیرہ ان باتوں سے دلی نفرت تھی، وہ ایک خاموشی پسند مرنجاں مرنج عالم تھا جس کا مطمحِ نظر اپنے کرہ میں بیٹھ کر فلسفہ کے چہرے سے نقاب اٹھانا ہو، بحث ومباحثہ درکنار اسکو شور وغل سے بھی نفرت تھی، وہ خاموشی پسند اور انتہائی خاموش [illegible] تھا یوں سمجھو کہ اگر اس کا بڑا بھائی باپ کی جائداد میں سے اسے کچھ حصہ نہ دیتا تو وہ عدالت میں جا کر چارہ جوئی کرنے کے عوض چپکا اپنے گھر میں بیٹھ رہتا اور یہ کہکر اپنے دل کو تسکین دے لیتا کہ "کون اس دردسر کو برداشت کرے، جلو جانے دو، ہم خود اس سے زیادہ جائداد حاصل کرسکتے ہیں"

اس کمزوری طبع سے قطع نظر وہ زبردست ارادہ کا مالک تھا، اس نے جو کچھ ترقی یا کامیابی حاصل کی محض اپنی قوت ارادی کی بنا پر، اسکی تمام زندگی قاعدہ قانون اور اصول کے ماتحت بسر ہوئی، ہر کام کیلئے ایک وقت اور ہر وقت کیلئے ایک کام کیا مجال کہ مجوزہ پروگرام میں ذرہ بھر تفاوت تو ہو جائے، خواہشات طبع کا اسپر کبھی اثر نہیں ہوا، وہ اپنی حرکات اور اقوال دونوں کو عقل کے ماتحت رکھتا تھا، تصنیف

وتالیف جو کچھ بھی کی وہ شہرت یا دولت کی خاطر نہیں، بلکہ اپنے خیالات کے اظہار کی نیت سے، بہت سے فاضل آدمیوں کا یہ خیال ہے کہ "تنقید عقل خالص" جسکی بنا پر اسکی شہرت ہوئی، ایسی کتاب ہے، جسکا ایک فقرہ بھی پڑھنے والوں کی رعایت یا خاطر سے نہیں لکھا گیا، ذہنی اور علمی حیثیت سے ہرڈر نے اس کا مقابلہ سقراط سے کیا ہے، اور اسمیں شک نہیں کہ یہ دونوں فلاسفر بڑی حد تک آپسمیں یگانگت اور یکسانیت رکھتے تھے، دونوں آزاد مزاج اور آزادانہ روش کے انسان تھے، دونوں کی توجہ ذاتی نصب العین کے حصول کیلئے وقف تھی انھیں اسکی پرواہ نہ تھی کہ لوگ کیا خیال کرتے ہیں اور ہمسے کیا توقعات رکھتے ہیں،

دونوں کے تخیل میں نفی کا رنگ، ایک امتیازی شان رکھتا ہے، دونوں انسانی عقل کی کمزوری سے آگاہ تھے، اور علم وفضل پر دوسروں کی طرح نہ نازاں تھے نہ مغرور، سقراط کی طرح کینٹ نے بھی شروع شروع میں اپنی توجہ علم الآفاق اور مابعد الطبیعات کی طرف مبذول کی لیکن بعد ازاں اسنے انسانی عقل کی پرواز کو محدود تسلیم کیا، اور حکمتِ منفی کی نبیاد ڈالی، بڑھاپے میں جاکر یہ حقیقت اس پر آشکارا ہوگئی کہ انسانی زندگی کی خوبی اور عظمت کا راز اس امر میں پوشیدہ نہیں کہ وہ چند علوم حاصل کرے یا اپنے دماغ کو معلومات فلسفیانہ کا خزانہ بنالے، بلکہ نیکی کے اکتساب میں اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے میں ہے، سقراط کی طرح کینٹ اس بات کا معترف ہے کہ دانائی، علم سے بہتر ہے، علم سے مراد فلسفہ ہے لیکن قرآن شریف نے صدیوں پہلے اس حقیقت کا اعلان کردیا۔ مَن یُؤتَ الحِکمَۃَ فَقَد اُوتِیَ خَیرًا کَثِیرًا.

جس طرح سقراط نے سوفسطائیوں کا مقابلہ کیا، اسی طرح کینٹ نے ہیوم کی لاادریت اور فرنچ فلاسفہ کے مخرب اخلاق فلسفہ اور ملحدوں کے الحاد کا مقابلہ کیا، اور اس لحاظ سے دنیا پر اسکا بڑا احسان ہے،

کینٹ کے دماغ کی ممتاز ترین خصوصیت اسکی زبردست قوتِ ادراک تھی جس کی بدولت وہ اپنے خیالات کو بہترین صورت میں ادا کرسکتا تھا، تعریفات، امتیازات، واعتبارات عقلی اور استنباط واستخراج میں اسکو یدطولیٰ حاصل تھا، علاوہ ان باتوں کے اس کا دماغ بہت بڑا نکتہ رس اور غوامض شناس واقع ہوا تھا،

قوتِ حافظہ ایسی زبردست تھی کہ جس کتاب کو ایک مرتبہ پڑھ لیا، اس کے مطالب تمام عمر کیلئے ذہن میں محفوظ ہو گئے، میرا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی فیلسوف ایسا نہیں گذرا جسکی قوتِ حافظہ غیر معمولی طور پر زبردست نہ رہی ہو، ہم نے فارابی اور ابن سینا کے متعلق بھی ایسا ہی پڑھا ہے، فارابی نے سفر میں فلسفہ کی ایک کتاب کسی شخص کے پاس دیکھی، اس کو ایک مرتبہ پڑھ لیا، گھر واپس آکر یاد داشت سے از اول تا آخر لکھا دی، بعد ازاں مقابلہ کیا گیا تو صرف چار پانچ جگہہ لفظی اختلافات پائے گئے، میرا عقیدہ یہ ہے کہ فلسفی کے لئے زبردست حافظہ کا ہونا پہلی ضروری شرط ہے، اب ہم کینٹ کی تصانیف کا ذکر کرینگے،

پہلے دور کی تصانیف تمامتر نیچرل سائنس، علم الآفاق اور ریاضی پر مشتمل ہیں،

ڈینامک فورسیز ۱۷۴۶ء میں شایع ہوئی جو ریاضی سے متعلق ہے، تاریخِ فلکیات ۱۷۵۵ء میں اور نظریۂ باد ۱۷۵۶ء میں، مبادی مابعد الطبیعات ۱۷۵۵ء میں،

دوسرے دور میں اسکی توجہ فلسفہ اور اخلاق کی طرف مبذول رہی، اثبات واجب الوجود ۱۷۶۲ء میں شایع ہوئی، مبادی اخلاق و الٰہیات طبعی ۱۷۶۴ء میں، فلسفہ اور مقادیر نافیہ ۱۷۶۳ء میں، اشکال اربعہ اور رویائے مابعد الطبیعات ۱۷۶۶ء میں، خیالات بر حسن و قبح اشیاء ۱۷۶۴ء میں،

تیسرے دور میں تنقید کا آغاز ہوا، ۱۷۷۰ء میں مبادی عالم حسی و ذہنی شایع ہوئی، اسکی اشاعت کے بعد کینٹ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف کی تیاری میں مشغول ہو گیا، اور ۱۷۸۱ء میں وہ معرکۃ الآرا تصنیف یعنی تنقید عقل خالص شایع ہوئی، پھر ۱۷۸۳ء میں مقدمہ مابعد الطبیعات شایع ہوا، آفاقی نقطہ خیال سے تاریخ عالم ۱۷۸۴ء میں، فلسفۂ اشراق ۱۷۸۵ء میں، فلسفۂ تاریخ پر تنقید ۱۷۸۵ء میں، اور مبادی علم الانسان اور مبادی فلسفۂ اخلاق بھی اسی سال شایع ہوئیں،

ابتدائے انسان یا آغازِ آفرینش اور مبادی نیچرل سائنس ۱۷۸۶ء میں شایع ہوئیں، تنقید عقل عملی اسکی دوسری معرکۃ الآرا تصنیف ہے - جو ۱۷۸۸ء میں منصۂ شہود پر آئی، اسی سال فلسفۂ اخلاق شایع ہوئی،

۱۷۹۰ء میں تنقید تصدیقات اور فلسفۂ جذبات شایع ہوئیں، ۱۷۹۰ء میں اسکی تصانیف کا چوتھا اور آخری دور شروع ہوا، ۱۷۹۱ء میں اس نے ایک کتاب لکھی جسمیں یہ ثابت کیا کہ "محض فلسفہ کی بنا پر واجب الوجود کا اثبات نہیں کیا جا سکتا"، ۱۷۹۲ء میں ضعف فطرت انسانی شایع ہوئی، ۱۷۹۳ء میں مذہب در حیطۂ عقل خالص، ۱۷۹۵ء میں صلح دوامی، ۱۷۹۷ء میں مبادی قانون اور مبادی فلسفۂ خیر و شر شایع ہوئیں — ۱۸۰۰ء میں المنطق اور مبادی منطق شایع ہوئیں، ۱۸۰۲ء میں جغرافیہ طبعی اور آخری کتاب یعنی فلسفۂ تعلیم ۱۸۰۳ء میں شایع ہوئی، ان کتابوں کے علاوہ کینٹ نے بیشمار رسالے مختلف مباحث پر لکھے، جن کا ذکر طوالتِ مضمون کی وجہ سے نظر انداز کیا گیا۔

اب ہم اگلی قسط میں اس کے فلسفہ کی اہمیت اور اسکی خاص تصانیف کا تذکرہ ہدیۂ ناظرین کرینگے،

سلسلۂ عالیہ مجددیہ

اور

علم حدیث

از

مولانا محمد فاروق صاحب سراُجی مدرس مدرسہ جامع العلوم کانپور

"ہندوستان میں علم حدیث" کے عنوان سے جو مضامین رسالہ معارف میں شایع ہوئے ہیں، اس میں جو چند تسامح اس عاجز کو معلوم ہوئے انھیں قلمبند کر کے ابلاغِ خدمت کرتا ہوں، اگر مناسب ہو تو کسی گوشۂ معارف میں شایع فرمادیں؛ عرصہ سے یہ اغلاط چلے آتے ہیں آجتک کسی نے اسکی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کی، آپ نے بھی اگر یوں ہی چھوڑ دیا تو پھر اسکے اور متعدی ہونے کا اندیشہ ہے۔

معارف میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ حضرت شاہ محمد معصوم صاحب رحمۃ اللہ کے صاحبزادوں میں ایک صاحب کا اسم گرامی محمد افضل تحریر کیا گیا ہے، اور لکھا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ نے ان سے سندِ حدیث حاصل کی تھی،

حضرت مجدد صاحب ؒ کی اولاد کا سلسلہ آج سے لیکر اس وقت تک انساب الانجاب اور تواریخ احمدی میں موجود ہے، نیز صاحب روضہ قیومیہ نے بھی آپکی اولاد کو بالتفصیل ذکر کیا ہے ان میں نہایت غور و تحقیق سے تلاش کیا گیا کسی سے پتہ نہیں چلا کہ آپ کے صاحبزادہ شیخ محمد افضل رحمۃ اللہ علیہ تھے،

شیخ محمد افضل ؒ جن سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے سندِ حدیث حاصل کی ہے وہ شیخ محمد افضل سیالکوٹی ہیں، آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام ربانی سے نہیں ملتا، بلکہ سلسلۂ بیعت و شاگردی آپ تک پہونچتا ہے۔ یہ حضرت دہلی میں تشریف فرما تھے، وہیں آپ کی درسگاہِ حدیث تھی؛

زمانہ حج میں سالم بن عبد اللہ مکی سے آپ نے سندِ حدیث حاصل کی تھی، اور حضرت خواجہ محمد سعید بن حضرت امام ربانی کے صاحبزادہ حضرت حجۃ اللہ شاہ محمد نقشبند رح کے خاص شاگرد و مُرید تھے، اور اس زمانہ میں تکمیل سلوک مجددیہ کرانے کے ساتھ درسِ حدیث دینے والا اجل علما میں آپ کے ہم پلہ کوئی نہ تھا،

آپ کا حال کسیقدر تفصیل سے معمولات مظہریہ، مقامات مظہریہ، اور بشارات مظہریہ میں موجود ہے، صاحبِ بشارات مظہریہ نے آپکے تمام اسناد کتب حدیث تفسیر التصوف اور سندِ مصافحہ و تسبیح تحریر کردیے ہیں، جو وہی ہیں جنکو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں درج کیا ہے، اور یہ بھی تشریح کردی ہے کہ آپ حضرت شاہ ولی اللہ کے اُستاد ہیں،

چونکہ آپ کی صحبت میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بارہ سال رہے، اور کتب درسیہ حدیث و تفسیر و غیرہ وغیرہ کی آپ سے تکمیل فرمائی، اور دورانِ درس میں کسبِ نسبت مجددیہ بھی فرماتے رہے، اور آپکو اپنا پیرِ صحبت سمجھتے تھے، اس لئے جو کتابیں حضرت مرزا صاحب کے حالات میں تحریر ہوئیں ان میں آپ کا کچھ مفصل تذکرہ آیا ہے،

اس مضمون میں ایک اور فرو گذاشت یہ ہوگئی ہے کہ سلسلۂ مجددیہ کے بعض خاص محدثین صاحب درس و تدریس کا ذکر رہگیا، اسلئے تتمیماً للافادہ ان کا بھی ذکر کرتا ہوں،

حضرت خواجہ سیف الدین بن حضرت خواجہ محمد معصوم رح اور نگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی تربیتِ باطن آپ کے سپرد ہوئی تھی؛ آپ تمام علوم میں خاص قابلیت رکھتے تھے، مکتوبات معصومی میں آپ کا ذکر جستہ جستہ آتا ہے۔

آپ کے صاحبزادہ و شاگرد حضرت خواجہ محمد اعظم رحمۃ اللہ علیہ المتوفی سنہ ۱۱۱۴ھ عالمگیری علماء میں خاص طور پر ممتاز تھے، فیض الباری[1] شرح صحیح بخاری آپکی تالیف سے ہے، اس کے علاوہ حضرت شیخ

[1] جواہر علویہ،

نور محمد بدایونی، حضرت حافظ محمد محسن نواسہ حضرت شاہ عبدالحق دہلوی، حضرت شیخ عبدالاحد ابن حضرت خواجہ محمد سعید، حضرت شیخ محمد عابد سنائی وغیرہ اس زمانہ کے مخصوص علما میں تھے، جن سے صدہا علماء نے استفاضہ فرمایا ہے،

حضرت شیخ عبدالاحد رحمۃ اللہ نے اپنی کثیر تصانیف متعدد علوم میں یادگار چھوڑی ہیں، نسباً مجددی ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصروں میں حضرت شاہ سراج احمد ابن محمد مرشد رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی بھی ہے، جن کا سلسلۂ سند حدیث ونسب اس طرح ہے، سراج احمد محمد مرشد عن محمد ارشد عن فرخ شاہ عن محمد سعید عن امام ربانی (رحمۃ اللہ علیہم) آپ کی تصانیف سے ترجمۂ فارسی صحیح مسلم، صحیح ترمذی، شرح صدور در حالات قبور، برد مسافرہ، رمان التاویل فی شرح الاکلیل وغیرہ ہیں، منجملہ ان کے شرح فارسی ترمذی شروح اربعہ ترمذی کے ہمراہ مطبع نظامی کانپور میں چھپ چکی ہے، آپ کی ولادت ماہ شعبان سنہ ۱۱۷۶ھ اور وفات ۲۱ ذی الحجہ سنہ ۱۲۲۰ھ ہے۔ حضرت شاہ ابوسعید مجددی اور شاہ رؤف احمد مجددی رحمہما اللہ علیہما آپ کے تلامذہ سے ہیں۔ (جواہر علویہ)

تیسرا سب سے بڑا تسامح جو معارف میں ہوا ہے، وہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی بابت ہے، آپ کو حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا شاگرد تحریر کیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے، آپ دراصل حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی صغرسنی ہی میں فارغ ہو کر آپ اپنے خاندانی منصب قضاء پر پانی پت میں ممتاز تھے، وہیں سلسلہ درس بھی تھا، گو پانی پت میں قیام کی وجہ سے درس وتدریس نے پوری شہرت نہیں پائی۔ مگر تصنیف وتالیف اور حقائق و معارف مجددیہ کے بیان میں آپ حضرت شاہ ولی اللہ کے تلامذہ میں سب سے فائق ہیں۔

اگر کہا جائے کہ آپ کی تصنیفات اس معاملہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے بڑھی ہوئی ہیں تو بیجا نہیں،

شاہ عبدالعزیز صاحب آپ کو بیہقی وقت اور آپ کے پیر حضرت مرزا جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ آپ کو علم الہدیٰ فرماتے تھے،

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجتہدانہ شان اگر آپ کے کسی شاگرد میں نمایاں ہے تو وہ صرف آپ کی ذات گرامی ہے،

یوں تو آپ کی بہت سی تصانیف ہیں، مگر تفسیر مظہری عربی دنیا میں ایک بہترین تصنیف ہے، جس کی خوبی کا اندازہ تمام متقدمین ومتاخرین کی مطول ومختصر تفسیر کے مطالعہ کے بعد آپ کی خاص تاویل دیکھنے سے کیا جا سکتا ہے،

اس تفسیر کا کچھ حصہ چھپ چکا ہے، اور پوری تفسیر خاص خاص کتب خانوں میں ہے۔ آپ نے اپنے پیر بھائی حضرت مولانا نعیم اللہ بہرائچی کو ایک خط لکھا ہے جس میں اس تفسیر کا حجم اور جو کچھ اسمیں ہے اسے ذکر کیا ہے، اسلئے اصل خط درج کیا جاتا ہے، القاب آداب اور کچھ خانگی حالات لکھنے کے بعد آپ لکھتے ہیں،

" فقیر از خدمت سامی دور است، اما بحکم المرء مع من احب دور نیست، انشاء اللہ تعالیٰ در بہشت صحبت موئیدہ میسر خواہد شد، تفسیر مظہری بفضلہ تعالیٰ کسوۂ اختتام پوشید، بفضل الٰہی در ضمن تفسیر قرآن متکفل بیان مذاہب فقہا وادلۂ شان در ضمن مسائل فقہ ومسائل کلام ومسائل تصوف وسیر ومغازی سید الانام واختلاف قرات کافی وشافی آمدہ این ہمہ محض ظہور کرامت مظہر (تلمیح بجانب مرشد خود) فیوض الٰہی است ورنہ این فرومایہ را چہ منزلت، و پنج مجلد قریب سہ صد جز وہست، در تقطیع کہ از یک تختہ کاغذ چہار ورق است، تمام شد، حق تعالیٰ مقبول جناب خود سازد "

"مکتوبات قلمی"

حضرت مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضور اقدس وانور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیر پر ایک رسالہ لکھنے کی فرمایش کی تھی اسے آپ نے لکھ کر حضرت

مرزا صاحب کی خدمت اقدس میں بھیجدیا تھا، گر وہ آپ کے حسب دلخواہ نہ تھی، اس لئے آپ نے قاضی صاحب کے پاس اسے بھیجا، اور چند کتابیں اور بھیجکر لکھا کہ اپنے علم کے مطابق ایک کتاب سیرت میں لکھو، قاضی صاحب نے اسکی تعمیل فرمائی، ایک رسالہ حذف اسناد کے ساتھ چودہ کتابوں سے مع حوالہ کتب لکھا، اس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام افعال فقہی ابواب کے ساتھ جمع فرما دیئے ہیں، اختلاف روایات کی تطبیق اور مذہب راجح کی ترجیح کے وجوہ بھی حسب موقع ایسے مجتہدانہ انداز سے درج فرمایا ہے جس کی خوبی کا اندازہ طالب علم حدیث ہی اچھی طرح کر سکتا ہے، یہ رسالہ ابھی طبع نہیں ہوا، اصل مسودہ حضرت قاضی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے، اس کے شروع میں اخلاق نبوی صلے اللہ علیہ وسلم پر ایک رسالہ ہے، صاحب مقامات مظہری نے آپ کے تبحر علمی کا ذکر کرتے ہوئے ایک اور رسالہ کا ذکر فرمایا ہے، جس کے خاص الفاظ یہ ہیں،

"در علوم عقلی ونقلی تبحر تام دارند، در فقہ و اصول بمرتبۂ اجتہاد رسیدہ کتابے مبسوط در علم فقہ با بیان ماخذ و دلائل مختار مجتہدان مذاہب اربعہ در ہر مسئلہ تالیف نمودہ اند، وآنچہ نزد ایشاں اقوی ثابت شدہ آن را رسالہ جدا مسمی بما خذ الاقوی تحریر فرمودہ در اصول نیز مختارات خود نوشتہ اند"

افسوس ہے کہ باوجود کوشش بلیغ اب تک میں آخری رسالے کی زیارت سے محروم ہی رہا،

رسالہ کلمات طیبات[1] میں چند مکتوبات آپ کے شائع ہوئے ہیں، وہ بھی خاص شان کے ہیں، ان سے بھی آپ کی تحقیقات عالیہ کا پورا اندازہ ہوتا ہے،

ردّ روافض میں سیف المسلول ایک رسالہ ہے، جو دہلی میں عرصہ ہوا چھپ چکا ہے، یہ بھی اپنے موضوع پر بہترین رسالہ ہے، شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے تحفہ سے قبل کی تصنیف ہے، اہل سنت کے لئے یہ رسالہ اسم بامسمیٰ ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے رسالے آپکی تصانیف سے ہیں،

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے وصیت نامہ کی بھی ایک مفصل شرح آپ نے تحریر فرمائی ہے،

[1] کلمات طیبات متضمن مکتوبات حضرت مرزا صاحب رحمہ اللہ،

جس کا نام المقالۃ الرضیہ فی النصیحۃ والوصیہ ہے،

اس کا ثبوت کہ آپ شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خط سے ہوتا ہے، جسکو حضرت شاہ صاحب نے حضرت مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا ہے، صاحب بشارات مظہریہ نے اسے نقل فرمایا ہے، اور کلمات طیبات میں بھی وہ شائع ہو گیا ہے، اسمیں قاضی صاحب کا ذکر کیا گیا ہے، کہ مصابیح اور صحیحین فی الحال آپ کے زیر درس ہیں، اور کتب ستہ بلکہ عشرہ متداولہ کی تکمیل کی غرض سے میرے پاس ہیں اسکے بعد جناب کی خدمت میں احرام صحبت باندھینگے، اصل مکتوب یہ ہے؛

"خدائے عزوجل آن قیم طریقۂ احمدیہ داعی سنن نبویہ را تا دیرگاہ داشتہ سلیمن را متمتع و مستفید گرداناد و از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد سلام محبت مشام مکشوف ضمیر منیر باد صحیفۂ شریفہ کہ مشحون بود بانواع لطائف ورود فرمود، فقیر زادہ شفقت سامی نسبت این فقیر و اولاد او تقریر نمودہ، الحمد للہ کہ ایشان یاد این فقیر و بزرگان میکنند، از یں امر توقع آنکہ میگردد احسن اللہ الیکم و ذکرکم اللہ تعالی امین عندہ بابت آمد در آنی و بیامدن ور شارتی رفتہ بود، مخدوما فقیر تا وقتیکہ داعیۂ الہی برائے چیزے وارد نشود، بظن و تخمین نتوان گفت، قلمی شدہ بود کہ بعض تلامذ را بصورت اسکہ خواہم نوشت خاطر مشتاق آن دقائق است، خدا کند کہ زود آن وعدہ منجز گردد، مولوی ثناء اللہ مصابیح و صحیحین استماع نمودند و مستعد کتب ستہ بلکہ عشرہ متداولہ اند، ہمین توجہ ہمت سامی توقع است کہ امنیت بظہور رسد و بعد ازان احرام صحبت بندند ہر قدریکہ وقت شریف گنجایش کند بیگرد کلمہ بہجت افزائے این فقیر شکستہ بال می باید بود والسلام"

"بشارت مظہریہ"

اس مکتوب کے علاوہ اور بھی چند قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی تکمیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی تھی، مثلاً حضرت قاضی صاحب ایک مکتوب میں جس کو آپ نے اپنے اہلیہ محترمہ حضرت مولانا شاہ نعیم اللہ بہرائچی کو تحریر کیا ہے، لکھتے ہیں کہ اسوقت میری عمر ۱۸ سال کی ہے، یہ مکتوب ۱۲۱۸ھ

سنہ ۱۲۲۶ھ کے درمیان میں لکھا گیا ہے، کیونکہ سنہ ۱۲۱۸ھ تاریخ وصال شاہ نعیم اللہ ہے اور سنہ ۱۲۲۶ھ آپ کی تاریخ وصال ہے،

اس حساب سے آپ کی پیدائش سنہ ۱۱۴۰ھ اور سنہ ۱۱۴۷ھ کے درمیان ہوئی ہے، اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا وصال سنہ ۱۱۷۶ھ میں ہوا، اگر قاضی صاحب کی پیدائش سنہ ۱۱۴۷ھ میں مانی جائے تو شاہ ولی اللہ صاحب کے وصال کے وقت آپکی عمر ۲۹ سال ہوگی، اور اگر سنہ ۱۱۴۷ھ سے پہلے مانی جائے تو اور عمر بڑھ جائیگی، اس حساب سے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے آپ ۱۳ سال بڑے تھے کیونکہ حضرت شاہ عبدالعزیز کی عمر ان کے والد کے وصال کے وقت ۱۶ سال کی تھی اور آپکی تکمیل بھی نہیں ہوئی تھی،

حضرت قاضی صاحب ایک علمی خاندان کے رکن تھے، علم آپ کے اجداد سے متوارث تھا، نیز حضرت شیخ محمد عابد سنامی جیسا باکمال عالم اور ان کے بعد حضرت مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ آپ کے مربی تھے، ایسا نہو ہوگا کہ انتیس سال تک آپ کی فراغت نہ ہوئی ہو، اور آپ نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے تکمیل کی ہو، نیز تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد دہلی میں آپ کے شاگردوں میں بعض خاص ہستیاں موجود تھیں جن کا پایہ شاہ عبدالعزیز صاحب سے اس وقت بڑھا ہوا تھا، جیسے شیخ الحدیث حاجی احمد وغیرہ،

حضرت قاضی صاحب نے اپنے قلم سے اپنا خاندانی حال لکھکر حضرت مولانا شاہ نعیم اللہ بہرائچی رحمۃ اللہ علیہ کو دیا ہے، انھوں نے بشارات مظہریہ میں اسے مفصل درج فرمایا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے سلسلہ میں دس پشت سے علم متوارث چلا آتا تھا، اور یہ آپ کے دادا حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی کی دعا کی برکت تھی، کیونکہ آپ حضرت کبیر الاولیا کی دسویں پشت میں تھے، جن کا سلسلہ نسب حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے،

صاحب بشارت مظہریہ آپ کے حالات کے ضمن میں ارشاد فرماتے ہیں،

"کہ باوجود ذات مستجمع کمالات حضرت مولانا ثناء اللہ پانی پتی است، از آیات سبحانی و نوری است

از انوار تجلیات ربانی و فاضل عالم درویش حامل و مکمل فقیہ و متکلم و محدث و مفسر و حافظ کلام اللہ ست و موصوف باخلاق حمیدہ و مکارم پسندیدہ و در امانت و دیانت و صلاح و تقوی و خوش خلقی و پاک طینتی و انجاح مہمات خلائق و کمال کسر نفس بینظیر و ہمیشہ بطاعت و عبادت و ریاضت و تدریس علوم ظاہر و باطن و مطالعہ و مباحثہ علوم دینی و تصانیف کتب مشغول از ینجا است کہ حضرت ایشان (یعنی حضرت مرزا جانجانان شہید رحمہ اللہ) میفرمودند کہ وجود کہ از اجتماع انوار کمالات ظاہری و باطنی و ضیاء صبح صلاح و تقوی ایشان دلم مستنیر نمی‌گردد و میفرمودند کہ وجود ایشان باعتقاد فقیر عزیز ترین موجودات است و از روے تقوی و دیانت روح مجسم اند، و مروج شریعت و منور طریقت و ملکی صفات اند، ملائکہ کرام تعظیم و تکریم ایشان میکنند"

تذکروں میں آپ سے استفادہ کرنیوالوں کا پتہ نہیں چلتا، صرف آپکے پیر بھائی حضرت شاہ نعیم اللہ بہرائچی آپکو بجائے اپنے پیر و مرشد حضرت مرزا صاحب کے سمجھتے تھے، اگر آپ اس سے راضی نہ تھے بلکہ خود کو کمترین مستفیدان شما خود را میداند" ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے، مگر حضرت شاہ صاحب اپنے حالات میں ارشاد فرماتے ہیں کہ میں دو مرتبہ بعد وصال حضرت مرزا صاحب پانی پت گیا۔ ایک مرتبہ ایک سال قیام کیا اور حضرت قاضی سے تحقیقات و تدقیقات تازہ معقول و منقول میں حاصل کیں،

ایک مرتبہ آپ کی طلب پر حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھنؤ تشریف لائے تھے، جیسا کہ مکتوب ذیل سے ثابت ہوتا ہے،

"فانی اللہ بقا باللہ حقایق و معارف آگاہ مولوی معنوی شیخ المشایخ عالم باعمل درویش کامل بلکہ مکمل شاہ محمد نعیم اللہ جیو صاحب سلمہ اللہ تعالی، بعد دعا و خیریت دارین و سلام سنت الاسلام اشتیاق تمام مکشوف را ے باد، .... احسان غرباے لکھنؤ فراموش کردم و نخواہم کرد حق تعالی نصیب خادم الفقراء محب درویشان گرداناد، آن اولاد و شاگردان و مریدان مولوی

نعیم اللہ صاحب رابدرجۂ اعلیٰ و بمرتبۂ قصویٰ رسا باد خدا ترس حق پرست حق شناس مالک کونین بادشاہ دارین گردانا د، و بخدمت جمیع آشنایان ساکنان لکھنؤ نام بنام، اسم باسم لبشر طِ ملاقات و لبشر طِ یاد بشرطِ استفسار سلام دعا سلام نیاز، سلام اشتیاق رسانید علی الخصوص بخدمت صاحبزادگان بالنہ و حضرات فرنگی محل وغیرہ وغیرہ "

اس مکتوب میں بہت سے نام لکھنے کے بعد ساکنان درگاہ شاہ پیر محمد و ساکنان درگاہ شاہ مینا و شاہ نصر اللہ و شاہ نصرت و ساکنان آں طرف دریا و این طرف دریا لکھنے کے لیے محلہ کھنیا بازار (قندہاری بازار کے پاس ایک محلہ تھا جواب مٹ گیا ہے) کے ہتر کو بھی خصوصیت سے ذکر فرمایا ہے جس سے آپکے اخلاق کا پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ایک دور دراز ملاقاتی کی یاد اپنے دل میں تازہ رکھی اور خط میں اسے فراموش نہ فرمایا، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام لکھنؤ کے دیندار غربا نے قاضی صاحب جیسے علامۂ زمان یگانۂ دوران کی آمد پر اپنی آنکھوں کو فرشِ راہ کر دیا تھا جس سے قاضی صاحب پوری طرح متاثر ہیں اور اسے بھلانا نہیں چاہتے،

تلاش کے باوجود اس کا پتہ نہیں چلتا کہ آپ نے کتنے دنوں قیام فرمایا تھا، مگر یہ ضرور ہے کہ مدتِ اقامت کا شمار دنوں میں نہیں بلکہ مہینوں میں ہے۔ اور اسکا زمانہ ۱۲۰۰ھ سے لیکر ۱۲۱۸ھ کا زمانہ ہے

لکھنؤ میں حضرت مولانا شاہ نعیم اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ و مدرسہ تھا، جس سے بہت سے لوگ مستفیض ہوئے" اور جس کا فیض لکھنؤ سے کانپور آیا، کانپور میں غدر کے بعد ہندوستانیوں کا سب سے پہلا مدرسہ قایم ہوا، جس کے مدرس اول مولانا مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی مقرر ہوئے اور عبدالرحمن خان صاحب مالک مطبع نظامی کانپور کے مساعی جمیلہ کی بدولت تمام ہندوستان میں علوم کی اشاعت ہوئی،

شاہنامہ کے دو شعر

از

پروفیسر شیخ عبدالقادر ایم۔ اے دکن کالج پونہ، رکن انتظامی دار المصنفین

شیخ صاحب مدت کے بعد معارف کی بزم علمی میں تشریف لائے ہیں اس لئے عجب نہیں کہ لوگ انھیں بھول گئے ہوں، وہ ہماری قوم کے ان چند مستثنیٰ تعلیم یافتہ افراد میں ہیں، جن کے فضل و کمال کا مشکِ عطر بیز "شیخ عطار" کی ہر طرح کی کوششِ اخفا کے باوجود علمی جماعت کے اعلیٰ حلقوں میں اپنی پردہ دری آپ کر رہی ہے، وہ ہندو مشرقی اور مغربی زبانوں کے ماہر ہیں، وہ نہ صرف عربی جانتے ہیں بلکہ عربی تحریر و گفتگو پر بھی قادر ہیں، فارسی زبان، محاورات، اشعار اور دواوین پر بالکل پرانے فارسی دانوں کی طرح عبور رکھتے ہیں، اور فارسی کی فیلالوجی، تاریخ، مختلف نسخوں، کتبخانوں، فہرستوں، پبلشروں اور مستشرقین کی تحقیقات اور تحریروں سے اسی طرح واقف ہیں جس طرح آج ہمارے ڈگری کے ڈاکٹر، لیکن اسی کے ساتھ وہ اسمیں بھی ایک چیز میں ان سے ممتاز ہیں یعنی وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان تحقیقات میں کون صحیح اور کون غلط ہیں۔

موصوف نے یہ ذیل کا مضمون اپنے کالج میگزین میں اپنے شاگردوں کے لئے فارسی میں لکھا تھا، مولوی محمد علی صاحب اسسٹنٹ ماسٹر اردو ٹرننگ اسکول پونہ نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، اس مضمون میں شاہنامہ کے دو شعروں کے متعلق بعض مستشرقین یورپ نے جو غلطیاں کی ہیں، وہ آشکارا کی گئی ہیں،

میری خواہش تھی کہ اس رسالہ کے ایک حصہ میں مشکل اشعار حل کئے جائیں، اور عسیر الفہم فقروں کی توضیح کی جائے، خصوصًا ان شعروں کی جو موجودہ درسی کتابوں میں داخل ہیں، اور جن کے مطلب سمجھنے میں طلبہ کو

وقت واقع ہوتی ہے، اور اکثر نازک مقامات پر ان کا قدم ٹھوکر کھا جاتا ہے، اور محاسنِ کلام کے سمجھنے میں فہم وادراک قصور کرتے ہیں، اس لئے فردوسی کے شاہنامہ میں سے دو بیتوں کو معرضِ بحث میں لاکر ابتدا کی جاتی ہے، اور دیکھتے ہیں کہ وہ پیغمبرِ سخن ان دو شعروں میں کیا کہتا ہے۔

(۱)

نوشیرواں کی بادشاہی کی داستان شروع کرنے کے پیشتر جہاں وہ بڑھاپے پر افسوس کرتا ہے اور بے وفا زمانہ کی شکایت کرتا ہے وہاں وہ کہتا ہے،

دم اژدہا دارد و چنگِ شیر — نماید کسی را کہ آرد بزیر

ہم آوازِ رعدست وہم زورِ گرگ — بیکدست برگ و بیکدست مرگ

دوسرے شعر کا متن دو نسخوں میں جن میں سے ایک شہر پیرس میں چھپا ہے، اور جسکو فرانسیسی سلطنت نے اپنے صرف خاص سے شایع کیا ہے، اور دوسرا میجر جیرٹ کی کوشش واہتمام سے کلکتہ میں طبع ہوا اور جس کی اشاعت دولت انگلشیہ کی طرف سے ہوئی ہے، بعینہٖ اسی طرح چھپا ہے، پروفیسر موہل جو مشہور ومعروف مستشرق اور پیرس کے نسخے کے مصحح ومترجم ہیں، فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں،

"Sa voik est celle du tonnerre, sa force celle du lonp; dans une main elle tient la fatigue, dans l'autre la mort"

انگریزی مترجمین وارنر اور وارنر نے اس فرانسیسی ترجمہ کا تتبع کرکے انگریزی میں اس طرح ترجمہ کیا ہے،

"It hath the might of wolf, and

thunder breath, In one hand Care and in the other death"

تعجب ہے کہ موہل جیسے پروفیسر اور وارنر و وارنر جیسے مترجموں کی نگاہ مطبوعہ شعر کی عبارت کی غلطی پر نہیں پڑی اور انکی نظر سے قافیہ کی قباحت پوشیدہ رہی، انھوں نے مصرع اول کے آخری لفظ "گرگ" کے دونوں کافوں پر عجمی، اور اول حرف کو مضموم پڑھا ہے، یعنی گُرگ (بمعنی بھیڑیا) اور توجہ نہیں کی کہ لفظ مَرگ " کے مقابلہ میں وہ لفظ صحیح نہیں ہوسکتا، کیونکہ گُرگ اور مَرگ کا باہم قافیہ ہی ٹھیک نہیں ہوسکتا،

برادران کتار نے جنھوں نے برادران وارنر کی طرح شاہنامہ کی بڑی خدمت کی ہے اور پورا شاہنامہ گجراتی میں ترجمہ کیا ہے، مصرعہ اولیٰ کے اخیر لفظ کو مرگ کی رعایت سے گَرگ بفتح اول پڑھا ہے، لیکن معنی بھیڑیے ہی کے لئے ہیں "گرگ" بمعنی لفظ ہے، اور "کرگ" قافیہ کی رعایت سے ناممکن، پس صحیح قرات اول کاف عربی مفتوح کے ساتھ ہے، یعنی کرگ جو کرگدن کا مخفف ہے، اور جسے انگریزی میں Rhinoceros اور ہندی میں گینڈا کہتے ہیں،

اس لفظ یعنی "کرگ" کے اشتقاق اور معنی میں اہل لغت کو دھوکا ہوا ہے، بعض کے نزدیک یہ لفظ "کرگ اور گردن" سے مرکب ہے، یعنی بھیڑیے کے مانند موٹی گردن والا جانور؛ جو فیل خوار بھی ہے، حقیقت میں اس بے زبان جانور پر لغت والوں نے بیجا ظلم کیا ہے، انصاف یہ ہے کہ اس کا ظاہر دو لفظوں سے مرکب ہے، ایک تو "کرگ" کہ اصل میں وہی ہندی لفظ "کھڑگ" (खड्ग) ہے، جس کے معنی خنجر کے ہوتے ہیں، اور دوسرا "دن" کہ ہندی میں "دھینو" धेनु ہے اور بمعنی "گاؤ" ہے، پس اس کے ترکیبی معنی "گاوِ خنجر دار" ہوتے ہیں، اس خنجر سے مراد اسکی ناک پر کا سینگ ہے، انگریزی میں جو لفظ رائج ہے وہ بھی اسی طرح یونانی لفظوں سے مرکب ہے، اور جس کے معنی "ناک کا سینگ" ہیں، جیسا کہ اسکیٹ (Skeat) نے تصریح کی ہے، اب شعر کو ملاحظہ فرمایئے "کجا" "مغربی بھیڑیے کی طاقت

اور کہاں شرقی گبیڈے کا زور۔

(۲)

شہزادہ نوش زاد نے اپنے باپ نوشیروان کے خلاف بغاوت کی ہے، نوشیرواں نے رام برزین حاکم
مدائن کو نامہ لکھا ہے کہ نوش زاد کو گرفتار کرلو اس نامہ کی ابتدا فردوسی نے یوں کی ہے۔

نخستیں بر و آفریں گسترید	کہ چرخ و زمان و زمیں آفرید
نگارندۂ ہور و کیوان و ماہ	فروزندۂ فرّ و دیہیم و گاہ
ز خاشاکِ ناچیز تا شیر و پیل	ز گرد پے مور تا رودِ نیل
گر از خاک بر چرخ گردان دوند	ہمہ زیر فرمانِ یزدان روند

تیسرے شعر کی عبارت بمبئی اور کلکتہ کے مطبوعہ نسخوں میں اسی طرح لکھی ہوئی ہے، اور فرانسیسی
اور انگریزی مترجموں نے اس کے معنی بیان کرنے میں غلطی کی ہے، پروفیسر موہل اس کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

Depuis le brin de bois sans ualeur
"Jusqn'a l elephant an das puissant
depuis la ponssiere que sonlue le :-
sonffle du la fourmi jusqn' an
Flots du Nil, tonte chose est sans
Les ordres de dien"

انگریزی مترجمین اس کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں۔

From worth less stnbble npto eleph-
hant And lion from the dust on mmets

Foot Upto the nile thongh men shall
rom the earth To turning hearen
They raan beneath Gods' sway"

برادرانِ کنتار کا بھی یہی ترجمہ ہے،

ہر ترجمہ میں "گرد پی مور" میں لفظ "گرد" کے معنی "خاک برانگیختہ" جسے عربی میں "غبار" کہتے ہیں، لئے
گئے ہیں، بقول پروفیسر موہل "گرد پی مور" کے معنی ہیں "وہ غبار جو چیونٹی کے پیر سے اڑتی ہے" اور انگریزی
ترجمہ کے مطابق "وہ غبار جو چیونٹی کے پیر پر جمی ہے"، ان دونوں معنوں کا مقصود "غبار قلیل المقدار" ہے
اس بنا پر شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ "غبار قلیل المقدار سے لیکر رود نیل تک" اس صورت میں غبار قلیل المقدار
کا مقابل رود نیل ٹھہرتا ہے، مگر یہ مقابلہ اہل ذوق کی نظر میں کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ یہ دو چیزیں
باہم غیر جنس ہیں، اس لئے ذوق سلیم اس قرأت کے قبول کرنے سے قطعاً ابا کرتا ہے، کیونکہ مطلب
موقع اور محل سے مطابقت نہیں کھاتا ہے، اگر رود نیل کے مقابلہ میں وہ نشان فرض کیا جائے جو چیونٹیوں
اور سیدانوں میں، بستیوں اور ویرانوں میں، باغوں اور جنگلوں میں چیونٹیوں کی کثرتِ آمد و رفت سے
پیدا ہوتا ہے، اور نہر کی طرح بہت چھوٹا، تنگ اور باریک راستہ نظر آتا ہے، تو معنی اور کلام میں خوبی
پیدا ہو جاتی ہے، اور رودِ نیل سے اس کا مقابلہ ٹھیک ہو جاتا ہے، لیکن کوئی فارسی کا لغت "گرد" کے
یہ معنی نہیں بتاتا ہے، اور نہ کسی فرہنگ میں اس کے یہ معنی ظاہر کئے گئے ہیں۔ مدت تک دل پریشان
و حیران و سرگردان رہا کہ اس قفل بستہ کی کنجی کیسے ہاتھ آئے، آخر کار نفتی دل سے رجوع کرتا رہا اور
فکر کے دروازے کو کھٹکھٹاتا رہا، بفضلہ مطلب کا دروازہ کھل گیا، اور اس قفل کی کنجی ہاتھ آگئی، یکایک
خیال گذرا کہ یہ لفظ "گرد" نہیں "کرد" ہے، غیاث میں "کرد" کے معنی نشان ہیں اور اسٹین گیاس
(Steingass) میں وہ "لکیر" ہے جو ہل کے چلانے سے پیدا ہوتی ہے، زیادہ صاف اور صحیح تر

معنی لین (Lane) کے مدّ القاموس میں ہے جو کہتا ہے،

(کردہ کرد sing) signifies a دبرۃ and is originally a Persian word and دبرۃ is a small Channel for irrigation between tracts of land sown or for sowing"

اس صورت میں "چیونٹیوں کے پاؤں سے بنے ہوئے "نہر نما نشان" میں اور "رود نیل" میں ایک قسم کی جنسیت پیدا ہو جاتی ہے" اور تقابل ٹھیک ہو جاتا ہے، اور حقیقت کے چہرے سے گرد دور ہو جاتی ہے۔ اگر مصرع کا یہ حل اہل علم میں شرفِ قبول حاصل کرے تو کچھ شک نہیں کہ پیغمبر سخن فردوسی کی خوش مذاقی پر نافہمی سے جو داغ پڑ گیا تھا وہ زائل ہو جاتا ہے۔

چو خوش گفت فردوسی پاک زاد

کہ رحمت بران تربت پاک باد

مکاتیب شبلی

طبع دوم،

مولانا کے خطوط و مکاتیب کا مجموعہ جو علمی، قومی، ادبی، اصلاحی، مذہبی معلومات کا خزانہ ہے، قیمت حصہ اول، عہ

قیمت حصہ دوم، عہ

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

۱۹۲۸ء میں سائنس کی علمی ترقیاں،

سائنس کی دنیا اپنی پوری تیز گامی سے آگے بڑھ رہی ہے، اس کی ترقی سے سال کا کوئی مہینہ کوئی ہفتہ بلکہ کوئی دن خالی نہیں جاتا، یہاں تک کہ نظام شمسی جب سال کا پورا دور ختم کر لیتا ہے تو سائنس کا بھی پچھلا علمی و عملی دور بہت کچھ بدل جاتا ہے، معارف ان تمام ترقیوں کی مختصر کیفیت ہر مہینہ میں سنا دیتا ہے اور اب چند سال سے ناظرین کے سامنے اس کی سالانہ روداد بھی یکجا پیش کر دی جاتی ہے، اسی دستور کے مطابق ۱۹۲۸ء میں سائنس نے جو علمی ترقیاں کیں ان کا مختصر خاکہ ہر شعبہ کے متعلق جداگانہ طور پر امریکن سائنٹفک اور المقتطف کے حوالہ سے ذیل میں درج کیا جاتا ہے،

کیمیا ۱۹۲۸ء میں فن کیمیا کی مدد سے مختلف ترقیاں ہوئیں، "مرض سرطان کے ازالہ اور کیمیا" کی بحث چند سال سے جاری ہے، اس سلسلہ میں اس سال بعض اہم کیمیاوی اجزاء سے اس مرض کے ازالہ کے عملی تجربے حاصل کئے گئے، اور اب وہ عام طور پر کام میں لائے جائیں گے،

اسی سال صنعتی طریقوں سے مختلف کیمیاوی اجزاء کی تحلیل و ترکیب سے مصنوعی شکر تیار ہوئی، پٹرول اور فطری گیس سے مختلف مرکبات تیار ہوئے جنہیں الکحل کے چند مواد کی صنعت کو خصوصیت حاصل ہے، جوہر فرد کو متعدد صنعتوں میں استعمال کیا گیا، کیمیاوی ترکیب کے لئے تیز حرارت پیدا کرنے کے جو طریقے اب تک رائج ہیں، ان میں مزید ترقی ہوئی ہے،

فن پرواز اس سال فن پرواز کو زیادہ تر اس حیثیت سے ترقی ہوئی کہ اس کے ذریعہ سے بعض دور دراز کی ایسی جگہوں کی درمیانی مسافت طے پائی جن کو ہوائی جہاز سے طے کرنا محال سمجھا جاتا تھا، چنانچہ اسی

پہلے مشہور ماہر پرواز ڈیشیرٹ اپنے ایک خاص جہاز پر جس کے سرے پر چکی کی طرح کا ایک گھومنے والا پہیا لگا ہوا تھا، لندن سے پیرس تک پرواز کرکے آیا،

دوسرا ماہر پرواز ولکنز ہے، یہ الاسکا سے سپتبرگن آیا جس میں اس کو شمالی منجمد علاقہ کے اوپر سے گذرتے ہوئے، قطب شمالی کے جنوب میں آنا پڑا تھا،

اس کے بعد گرف زلین کا نام آتا ہے، اس نے جرمنی سے امریکہ اور امریکہ سے جرمنی تک کی مسافت ہوائی جہاز سے طے کی،

فن پرواز میں ان تجربوں کے علاوہ اس سال تجارتی ہوائی جہازوں کی سرعت رفتار میں مزید ترقی ہوئی ہے، اب ان میں پہلے سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے، جس سے تجارتی حیثیت سے کافی فائدہ پہونچنے کی امید ہے،

لیکن درحقیقت اس سال فن پرواز کی اہم ترین ترقی وہ ہے جو امریکہ کی پاکارڈ کمپنی کی کوششوں سے ظہور میں آئی، اس کمپنی نے اپنے ہوائی جہازوں کے لئے ایک ایسا نیا آلہ ایجاد کیا ہے، جس کے سبب سے اب نیزین (وہ سیال جو ہوائی جہاز کے انجن میں جلایا جاتا ہے) کی پہلے سے بہت کم مقدار جلنے پاتی ہے، اور اس سبب سے اس سیال کی تھوڑی سی مقدار بھی بہت بڑی مسافت کے قطع کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے، اس ایجاد نے جہازوں کی تیز رفتاری میں پہلے سے بہت زیادہ ترقی پیدا کردی ہے،

بے تار کی برقی، اس سال سے بے تار کی برقی دور دور تک کے مرکزوں تک کے لئے بھی کامیاب ہوگئی چنانچہ اس وقت یورپ و امریکہ کے درمیان بے تار کی برقی کا سلسلہ جاری ہے،

مسٹر مارکونی چھوٹی چھوٹی شعاعوں کے استعمال کرنے اور ان کو بے تار کی برقی کے ذریعہ ادھر ادھر منتقل کرنے کے نظریہ کو پیش کرکے کافی شہرت حاصل کرچکے ہیں، چنانچہ اب اس نظریہ کا

مخصوص نام "بحث مارکونی" قرار پاچکا ہے، ۱۹۲۸ء میں اس بحث نے مزید ترقی حاصل کی، اسی سال سے برطانوی شہنشاہیت کے مختلف حصص میں بے تار کا برقی سلسلہ جاری ہوگیا ہے، اور مختلف ممالک بے تار کے برقی کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئے ہیں،

تصویر کشی، اب تک مصوری اور تصویر کشی میں یہ نمایاں فرق سمجھا جاتا تھا، کہ عکاس (کیمرا) چیزوں کو ان کے اصلی رنگوں کے ساتھ پیش کرنے سے قاصر ہے، لیکن مصور کا موقلم ہر قسم کی رنگ آمیزی پر قادر ہے، مگر ماہرین سائنس فن تصویر کشی سے اس بدنما داغ کو دور کرنے کی فکر میں مدت سے لگے ہوئے تھے، چنانچہ اس سال ان کے مساعی بہتر شکل میں کامیاب ثابت ہوگئے، جس کی وجہ سے اب عکاس اشیاء کا اصل نقش ان کے طبعی رنگوں کے ساتھ اتار سکتے ہیں،

فن تصویر میں اس کی یہ ترقی بھی قابل ذکر ہے، کہ اب ٹیلیفون پر گفتگو کرتے ہوئے متکلم کی دھندھلی سی تصویر بھی نظر آئیگی، اس لئے ٹیلیفون پر گفتگو کرنے والے اب ہر ایک دوسرے کا مشاہدہ بھی کرسکتے ہیں،

علم فضا، فضائی حوادث اور موسمی تغیرات کی اطلاعوں کو قبل از وقوع شایع کرنے کا طریقہ تقریباً پچاس سال سے جاری ہے، اس کے ذریعہ سے دنیا جن ہلاکتوں سے محفوظ ہوجاتی ہے، اس کا تجربہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے، اس لئے علم فضا کی طرف ماہرین علوم نے خاص توجہ کی ضرورت محسوس کی ہے، چنانچہ امریکہ اور یورپ کے ماہرین علم فضا کی ایک کانفرنس مئی ۱۹۲۸ء میں پیرس میں منعقد ہوئی، تاکہ اس فن کی ترقیوں پر اجتماعی حیثیت سے مزید بحث و تحیص کی جائے اور اس کی ترقی کے مزید وسائل اختیار کئے جائیں، چنانچہ اس سلسلہ میں طے پایا کہ سمندر کی سطح پر فضائی حوادث و موسمی تغیرات کے لئے مختلف سلطنتوں کے جتنے اسٹیمر کام کرتے ہیں سب کو منظم کرکے ایک سلسلہ میں منسلک کیا جائے، اور تمام خبروں کو فوراً بے تار کی برقی کے طریقہ سے شایع کردیا جائے تاکہ سمندر

کے تمام جہاز اور ہوائی جہاز بیک وقت حسب ضرورت ان سے فائدہ اٹھا سکیں، اوران کو اپنی نقل وحرکت میں موسمی تغیرات اور فضائی حوادث سے کسی قسم کا نقصان پہونچنے کا خطرہ باقی نہ رہے،

ہیئت، علم ہیئت کی ترقیوں میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر وہ عظیم الشان دوربینیں ہیں جنمیں سے ہر ایک کے آئینہ کا قطر ۲۰۰ انچ ہے، توقع ہے کہ ان سے ایسے نئے پانچ لاکھ ستارے نظر آئیں گے جو اب تک نظروں سے پنہاں رہے ہیں،

نیز اسی سال، ماہرینِ فن کے نزدیک ایسے دلائل جمع ہوئے جن سے پتہ چلتا ہے کہ کہکشاں قبہ جنوبی کے نصف حصہ میں ایک بعید ترین نقطہ پر گھومتا رہتا ہے، اس کے علاوہ چند مزید کہکشاں بھی دریافت ہوئے ہیں جنمیں سے بعض ہم سے تقریباً ایک لاکھ نوری سال کی مسافت کی مقدار سے دور ہیں؛

طبعیات، پروفیسر ملکن امریکی نے جن فضائی شعاعوں کا پتہ چلایا تھا، اب ان کے مباحث نے بھی ترقی کی، اب ان کا خیال ہے کہ وہ شعاعیں کہربائی ذروں یا سدیوم کے بعض بسیط عناصر کے ذرات سے مرکب ہیں،

اسی سال مختلف ماہرینِ فن ٹیبو، ہاٹٹ، اسپرن، اور ہیوگ وغیرہ اپنے اپنے تجربہ سے جداگانہ طور پر ایک جدید شعاع کی دریافت میں کامیاب ہوئے، اس جدید شعاع کا درجہ شعاع بنفشجی اور شعاع اکس کے درمیان ہے، اس لئے ان دونوں شعاعوں کے درمیان میں جو جگہ خالی سمجھی جاتی تھی وہ اس دریافت سے پوری ہوگئی،

جغرافیہ، جغرافی تحقیقات کے سلسلہ میں سب سے اہم واقعہ ایک اطالوی جہاز کی غرقابی ہے جو بعض اہم جغرافی تحقیق کے لئے سفر کر رہا تھا، لیکن مسرت ہے کہ اس کے تمام سیاح بخیر وخوبی محفوظ رہے،

البتہ ایک دوسرے سلسلہ میں ناروے کا ایک مشہور سیاح اسنڈسن کی مفقود الخبری سخت

قابلِ افسوس ہے، اسی سال مشہور ماہر پرواز ولکنز اور امِلسین نے جغرافی تحقیق کے لئے الاسکا سے سپٹبرگن تک سفر اختیار کیا، اور دونوں کی تحقیق سے یہ پایۂ ثبوت تک پہونچ گیا کہ شمالی منجمد علاقہ زمین کی سطح سے خالی ہے،

فضائی تحقیق کے سلسلہ میں قطب جنوبی کی طرف دو وفود بھیجے گئے، ان میں سے ایک کمانڈر برڈ کی سرکردگی میں تھا، اور دوسرا جارج ولکنز کی سرکردگی میں،

طب، فن طب میں اس سال فیتامن کے مختلف مباحث زیرِ غور رہے، مثلاً اس کا مفرد تیار کرنا، جسم میں اس کی زیادہ مقدار ہو جانے سے خطرہ کا پیش آنا، اور اسی طرح اس معالجہ میں فیتامن کا کیا عمل ہوگا، جو اطبا نے عورتوں کے بانجھ پن کے لئے تجویز کیا ہے،

ماہرینِ طب نے صفراوی بخار کے تعدی کو افریقہ کے بعض قسم کے بندروں پر آزمایا، اور وہ کامیاب ثابت ہوا، اس سے محققین کے لئے یہ آسانی ہوگئی کہ وہ اپنے ان تجربوں کو جو انسانوں کے لئے کرنا چاہتے ہیں، پہلے بندروں پر آزمایا کریں، کیونکہ تجربہ کے لحاظ سے دونوں کے اثرات یکساں ہونگے، اور انسان کی زندگی تجربوں کے خطرات سے محفوظ رہیگی،

وسکنسن یونیورسٹی کے بعض اہلِ تحقیق کے نزدیک جسم انسانی میں خون کی تولید تانبے کی ایک خاص مقدار سے ثابت ہوئی، اوران کے خیال میں تانبے کی یہ خاص مقدار جسم میں موجود رہتی ہے ورنہ اب تک جسم کے ضروری واساسی اشیاء میں چند آہنی قسم کے نمکوں کا وجود تسلیم کیا جاتا تھا،

اسی طرح اس سال بعض کامیاب جراحی سے پتہ چلا کہ انسان اپنے مغز کے نصف حصہ کو کھو کر بھی زندہ رہ سکتا ہے، چنانچہ ایک جراح ایک مریض کے نصف مغز کو نکالنے میں کامیاب رہا، اور مریض کو کوئی نقصان نہیں پہونچنے پایا،

بعض لوگ کچی کلیجی کے استعمال سے انیمیا فقرِ دم یعنی (خون کی تولید کم ہونا) کے علاج میں کامیاب رہے،

برقی انجینیرنگ برقی آلات کی ساخت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی، بے تار کی برقی کے ذریعہ دور دراز مقام سے مشاہدہ کرنے کی جو تحقیق ہوئی تھی، اس کو اس سال مزید ترقی حاصل ہوئی، اور عملی طور پر امریکہ و یورپ کے درمیان اس کا سلسلہ قایم ہوگیا،

اس سال بعض ایسے آلات بھی ایجاد ہوئے جو زندہ انسان کی طرح کار آمد ہیں، مثلاً ایک ایسا آلہ بنایا گیا ہے، جو ٹیلیفون کے احکام سنکر ان کی بجا آوری کرتا ہے،

ایک دوسرا آلہ ہے جو ریاضی کے ایسے حسابات کو بہت تھوڑے وقفہ میں حل کر دیتا ہے، جس کو لوگ متعدد دنوں میں تیار کرتے ہیں،

اس سال ایسے منارے بھی تیار کئے گئے ہیں، جو گیس نیوں کے ذریعہ سے کہرے کے پردے کو چاک کر دیا کریں گے،

اسی سال آسمانی بجلی کی علمی تحقیق و تدقیق کا بھی مزید سامان بہم پہونچا، بجلی سے جو شرارے پیدا ہوتے ہیں، ان کو یکجا جمع کر کے کام میں لانے کی کوشش کی گئی،

"ر"

الفاروق

مولانا شبلی مرحوم کی اس مشہور آفاق تصنیف کے بیسیوں اڈیشن مسخ شدہ صورت میں اور معمولی کاغذ پر بکثرت فروخت ہو رہے ہیں، مگر اہل نظر کو ہمیشہ اس کے اعلیٰ اڈیشن کی تلاش تھی، مطبع معارف نے نہایت اہتمام اور سعی بلیغ سے اس کا نیا اڈیشن تیار کرایا ہے، جو حرف بحرف نامی پریس کانپور کی نقل ہے، نہایت عمدہ کتابت اعلیٰ چھپائی عمدہ کاغذ دنیائے اسلام کا رنگین نفیس نقشہ، مطلا ٹائٹل، ضخامت ۴۱۲ صفحے

قیمت: للعہ

"منیجر"

اخبار علمیہ

ڈاکٹر بوس کے نظریہ کی تردید

ہندوستان کے مایہ ناز بنگالی ماہر سائنس سر جے، سی بوس نے عرصہ کی تحقیقات اور خود ساختہ آلات کی مدد سے یہ ثابت کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی، کہ انسانوں کی طرح نباتات میں نہ صرف زندگی ہے بلکہ ایکے اعضا بھی ہیں، اور وہ اعضا حیوانی اعضاء کی طرح اپنے فرائض انجام دیتے ہیں، حتی کہ ان کے دلوں کی حرکت بھی آلات کے ذریعہ معلوم کیجا سکتی ہے، اپنے اس نظریہ کو پیش کرنے کے لئے انھوں نے یورپ کے مختلف ملکوں کا سفر بھی کیا، لیکن اب نئی دنیا سے یہ آواز بلند ہوئی ہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے اور اس کے رد میں امریکہ کے مشہور علمی جریدہ سائنٹفک امریکن میں وہاں کے سب سے بڑے اور مستند ترین ماہر نباتات کا ایک مضمون شایع ہوا ہے، چنانچہ خود اس رسالہ کے اڈیٹر کا خیال ہے کہ ہمکو ایک بھی ایسے امریکن نباتاتی کا علم نہیں ہے جو سر بوس کے نظریہ کا قائل ہو، "سا"

دنیا کی بلند ترین عمارت

چیکاگو میں ایک عظیم الشان دفتری مکان کی تعمیر کا سامان کیا گیا ہے، یہ دنیا کی بلند ترین عمارت ہوگی، اس کا نام کرین ٹاور ہوگا، اس کی ۵۰ منزلیں ہوں گی اور اس کی بلندی ۲۲۰ فٹ ہوگی، یہ بلندی دنیا کے بلند ترین منارہ ایفل (واقع پیرس) سے بھی ۲۰ فٹ بلند ہوگی، اس کی وسعت ۲۵۰۰۰۰۰ مربع فٹ ہوگی، یہ وسعت دنیا کے وسیع ترین دفتر کی وسعت سے سہ گنی ہوگی،

اسی سلسلہ میں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپ ہے، کہ دنیا کا بلند ترین منارہ ایفل آج سے چالیس سال قبل بنایا گیا تھا، اور گذشتہ ماہ بہت دھوم سے اس کی سالگرہ منائی گئی، یہ منارہ نہ صرف تماشا او

مناظر کے لئے ہے، بلکہ اس پر موسم نما لاسلکی کے دفتر اور طبیعیاتی تحقیقات کی تجربہ گاہ بھی ہے، اس چالیس سال کے عرصہ میں ..... ۴۰ آدمی اس مینارہ پر چڑھ چکے ہیں، "ٹی"

ہوائی جہاز اور مہلک حادثے

عام طور سے لوگوں کا خیال ہے کہ ہوائی جہاز میں جان کے ضایع ہونے کا سب سے زیادہ خطرہ ہے اور اسی خوفِ جان کی وجہ سے ایک بڑی تعداد اس سے اب تک کنارہ کش ہے، اس بیجا خطرہ کو دور کرنے کے لئے متعدد ممالک نے اپنے یہاں کے اس قسم کے حادثات کے اعداد شایع کئے ہیں اور درازیٔ سفر اور طوالتِ راہ کو پیش کرتے ہوئے، انھوں نے بتایا کہ دنیا کی تمام سواریوں میں سب سے کم حادثے ہوائی جہاز ہی میں پیش آتے ہیں، "سا"

صنعتِ طباعت کی ایک ایجاد

اس وقت تک صنعتِ طباعت میں جو لوہا یا جستہ ٹائپ کے طور پر استعمال ہوتا تھا، وہ بہت وزنی تھا، اب طباعت کی ایک تختی ایجاد کی گئی ہے، جو اتنی پتلی اور باریک ہوتی ہے کہ اس کو خط کی طرح بذریعہ ڈاک بھیجا جا سکتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اتنی مضبوط ہے کہ عام دھات سے زیادہ دیرپا ہے، اس کے موجد کا نام فرڈیسی گولڈ نیام ہے، اس تختی کو ۴۰۰ء۵ پونڈ کے وزن کے ماتحت طیار کیا جاتا ہے اور آج کل ریاستہائے امریکہ کے بیشتر روزنامے اسی کو استعمال کر رہے ہیں، "سا"

دل کی حرکت اور آواز کی نمائش،

اگرچہ عکس ریز کے ذریعہ صرف قلب کی حرکت کا پتہ چلتا ہے اور اسی کی تصاویر بھی لیجا سکتی ہیں، اور آلۂ سماع کے ذریعہ صرف اس کی آواز سنی جاتی ہے، لیکن اب لفٹننٹ اے، ایچ ہنزن نے ایک ایسی مشین ایجاد کی ہے جس کے ذریعہ حرکت کی تصویر اور اس کی آواز دونوں کو جمع کر کے گویا تصاویر کی طرح دکھایا جا سکتا ہے، یہ لفٹننٹ دنیائے تصویر کے مشہور امریکن مرکز لاس انجلز کا رہنے والا ہے خیال

کیا جاتا ہے کہ اس مشین سے طبی دنیا میں بہت کچھ فائدہ اٹھایا جائیگا، "سا"

نئی محافظ جان کشتیاں

سمندرات کے خطرات سے انسان ہمیشہ محفوظ نہیں رہ سکتا، اور جب اس قسم کے حادثے واقع ہوتے ہیں، تو انسانی جانوں کی حفاظت کا دار و مدار زیادہ تر جہاز کی محافظ جان کشتیوں پر موقوف ہے، اب جرمنی نے اسی سلسلہ میں عجیب و غریب کشتیاں تیار کی ہیں، اور تجربہ کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ اس میں دوسری کشتیوں کے مقابلہ میں بعض ممتاز خصوصیتیں ہیں، یہ دھات کی کشتی ہے اور اس میں ہوائی کمرہ بھی ہیں جنکی وجہ سے یہ کبھی بھی ڈوب نہ سکے گی، یہ ایک موٹر کے ذریعہ چلتی ہے، اور یہ موٹر ایسے حصہ میں اور اس طرح لگایا گیا ہے کہ وہاں تک کسی صورت سے بھی پانی نہیں پہونچ سکتا، اور اس لئے اس کے خراب ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں، اس موٹر میں گیسولائن استعمال کیا جاتا ہے، "سا"

طیارہ شکن توپیں،

ایک طرف امریکہ اور یورپ کی فاتح اقوام دنیا میں صلح و آشتی کے قیام کے لئے معاہدوں پر دستخط کر رہی ہیں، اور دوسرے آلاتِ حرب کی ہلاکت زائی بھی مضاعف کیجا رہی ہے، چنانچہ امریکہ وغیرہ کے پاس ایسے جنگی ہوائی جہاز موجود ہیں جو ۲ ہزار پونڈ بم لیجا سکتے ہیں، اور اسی کے ساتھ مدافعت کیلئے عجیب طیارہ شکن توپیں بنائی گئی ہیں، ان کے متعلق ماہرینِ حرب کا دعوی ہے کہ کوئی طیارہ بھی ان سے کسی صورت سے بچ کر نہیں نکل سکتا، اور یہ توپیں ایک سکنڈ سے کم میں ۵۰ گز کا چکر کاٹتی ہیں، "سا"

ایک مجر کچھوا،

امریکہ کے عجائب خانہ میں ایک مجر کچھوا آیا، اور اس نے تین مختلف شعبوں کے ماہرین کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے، یہ سنگ شدہ کچھوا چین سے امریکہ لایا گیا ہے، وہاں اس کو ایک مقدس جانور سمجھا جاتا تھا، اس کی پیٹھ پر کچھ عبارت لکھی ہوئی ہے، اور اس کے متعلق ماہرینِ اثریات کا خیال ہے کہ وہ

ہ ہزار سال کی عبارت ہے، دوسری طرف شعبۂ حیاتیات کے علما اس کو اس نظر سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ جانور جس جنس سے پیدا ہوا ہے، اس کی یہ نوع اب تک لا معلوم تھی، اور کہیں بھی اسکی کوئی مثال نظر نہیں آتی تیسری طرف ارضیات کے اساتذہ کا خیال ہے کہ اس کچھوے کا زمانہ موجودہ عہد سے ایک کرور نوے لاکھ سال پہلے تھا، اس کے کتبات کو پڑھ لینے کے بعد یہ کچھوا عام عجائب خانہ میں رکھدیا جائیگا تاکہ ہر شخص اس کو اچھی طرح دیکھ سکے،

تیز ترین کشتی

میجر ایچ، او، ڈی، سی گویو اپنے موٹر کی دوڑ کی وجہ سے جسمیں انھوں نے دنیا کی تیز ترین رفتار کو بھی کم ثابت کر دکھایا ہو، اب زمین کے بعد پانی پر بھی اپنا سکہ جمانا چاہتے ہیں، اسی خیال سے انھوں نے ایک کشتی بنوائی ہے اس میں ایک ہزار گھوڑوں کی قوت ہوگی، اس کا نام مس انگلنڈ ہوگا، اور ان کا خیال ہے کہ اتوقت ایک گھنٹہ میں ۹۰ میل کی جو سب سے زیادہ تیز رفتار ہے، اس پر سبقت لیجائے،   (س ا)

انگلستان کی انتخابی قوت

اس مرتبہ برطانیہ کے دار العوام کے لئے ۲۱ سالہ عورتوں کو راے دینے کا جو عام حق حاصل ہو گیا ہے، اس نے وہاں کے راے دہندوں کی تعداد بڑھا دی ہے اس سال ان کی تعداد ۲۸،۰۰۰۰۰۰ ہے، اور گذشتہ انتخاب کے وقت یہ تعداد صرف ۲۱،۰۰۰۰۰۰ تھی، اس کے معنی یہ ہیں، کہ اس تعداد میں ستر لاکھ کا اضافہ ہوا ہے، انگلستان اور ویلز کی تعداد ۲۵۰۹۲۵۳۶ ہے، اور اسکاٹ لینڈ کی ۲۹۸۰۲۵۹، اس مرتبہ عورتوں کی جو تعداد بڑھی ہے، وہ ۳۵۷۷۰۶ ہے،   (ڈی)

"ن"

ادبیات

ہم آہنگیٔ تخیل

از

جناب خواجہ منظور حسین صاحب دہلوی

غالب   میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی"   سُن کے ستم ظریف نے مجھکو اُٹھا دیا کہ "یوں"

حزین   "بچشم رقیب گفتمش "محرم روے خود مکن"   کرد بکار دیدہ ام مصلحتِ شنیدہ را

غالب   تم جانو تمکو غیر سے جو رسم و راہ ہو   مجھکو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو؟

حزین   کاش آن گلِ شگفتہ در آغوشِ خار و خس   می زد پیالہ، لیک بہ سرگران نبود

غالب   تماشا کر اے محوِ آئینہ داری   تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں!!

حزین   جلوہ در خانۂ آئینہ بخود نمائی   گر بدانی کہ بہ حسرت نگرد دیدار چہ کرد

غالب   اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے   "تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر"

حزین   چہ لذت بود لے قاتل حزینِ نیم بسمل را   کہ در خوں می تپید و آفریں می گفت بر دستش

غالب   فریاد کی کوئی لے نہیں ہے   نالہ پابندِ نے نہیں ہے

حزین   شکایت نیست مطلب نالہ آہنگ است می نالم   ز دل تنگی نمی نالم، دلم تنگ است می نالم

غالب   آ کہ میری جان کو قرار نہیں   طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں

حزین   رفتی و در تپ و تاب انداختی حزیں را   باز آ کہ در فراقت دل ناصبور دارم

غالب   ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد   مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

حزیںؔ افسردہ شد چو حزیں از میانہ رفت — مجنوں گذشت و شورِ بیاباں فرونشست

غالبؔ اہلِ بینش نے بحیرت کدۂ شوخیٔ ناز — جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا

حزیںؔ عجب بود کہ جوہر حلقۂ بیروں درگردد — چنیں کآئینہ را عکسِ تو لبریزِ صفا گردد

غالبؔ نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بیخبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

حزیںؔ زسنگِ حادثۂ دہر ایمنیم حزیں — دلِ شکستۂ ما را دگر چہ خواہد کرد

غالبؔ کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب — اک آبلہ پا وادیٔ پرخار میں آوے

حزیںؔ مدتے شد کہ زدشت آبلہ پایئے نہ گذشت — جگر از تشنگیٔ خارِ بیابانم سوخت

غالبؔ نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے — لگاوے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

حزیںؔ کسان طاقتم تا پردہ داری می کند حسنش — رخش در شام خط ماہِ سحاب آلودہ را ماند

غالبؔ دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا — یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

حزیںؔ از دست بہ کونین نہ گردیم تسلی — این ہردو بدست و کفِ افسوسِ ہمان است

در عشق دل از کوثر و رضواں چہ کشاید — از دوست تسلی نتواں گشت باین ہا

غالبؔ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

حزیںؔ زہم گر نگسلد شیرازۂ دفتر بہاراں را — ورق گردانیدنِ برگِ خزاں ہم دیدنی دارد

غالبؔ توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

سعدیؔ باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست — در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

غالبؔ میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں — گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا؟

حزیںؔ شادیم بہ تشنہ کامی اما — ناموسِ شراب خانہ ات کو؟

غالبؔ نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

خسروؔ جراحتِ جگر خستگاں چہ می پرسی — زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالبؔ ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن — ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھکر عذرِ مستی ایک دن

خسروؔ جاناں! اگر شبیت دہن بر دہن نہم — خود را بخواب سازد و گوئیں دہانِ کیست

غالبؔ محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عرفیؔ ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ — این ہا ہمہ راز است کہ معلومِ عوام است

قطعۂ تاریخ وفات

جناب مولانا حکیم سید برکات احمد صاحب مرحوم طبیب خاص نواب صاحب ٹونک

از مولانا عبد الواسع صاحب صفا پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

وحیدِ دہر، فریدِ زماں، محققِ عصر — یگانہ کہ بعلم و ہنر نہ داشت مثال

حکیم و فاضل و علامہ و طبیب و ادیب — محدث و متکلم، فقیہ و صاحبِ حال

نظیرِ رازی و طوسی و رشکِ غزالی — عدیلِ شیخ رئیس و امامِ استدلال

رخش ز نورِ عبادت چو نیرِ تاباں — دلش ز معرفتِ کردگار مالامال

در اسم اوست پس و پیش احمد و برکات — بدند جمع بذاتش ہمہ صفاتِ کمال

بغرہ مہِ اول ربیع صرصرِ موت — نمود حیف بہارِ حیاتِ او پامال

قضا بہ خلدِ بریں برد روحِ پاکش را — اجل کشاد در وصلِ ایزدِ متعال

دلم ز فرطِ الم می طپید چو برقِ طپاں — ربود صبر و قرارم، وفور رنج و ملال

صفا شنید پے رحلتش ز ملہمِ غیب

نہفت زیرِ زمیں مہرِ آسمانِ کمال

۱۳۴۷ھ

غزل

بہ مشاعرۂ اعظمگڈھ

از جناب مولانا عبد السلام صاحب شیم ندوی

یہیں سے ہوش کھو کر اُس طرف اے نامہ بر جانا
خبر کو یار کی جانا تو ہو کر بے خبر جانا

ابھی مرتا ہوں نہیں بس ایک ہی لحظہ ٹھہر جانا
اثر اپنی دوا کا دیکھ کر اے چارہ گر جانا

اسی سے زندگی قائم ہے تیرے تلخکاموں کی
پیالہ زہر کا خالی ہوا پھر آکے بھر جانا

پریشانی بھی تھی وصلِ صنم میں وجہِ دلجمعی
سکونِ قلب تھا رہ رہ کے زلفوں کا بکھر جانا

یہی ہے زندگی اب تک جو گذری اور گذریگی
تو اس جینے سے پہلے چاہئے تھا ہمکو مر جانا

خزاں دیدہ جو کچھ پتے پڑے تھے آشیانے میں
انھیں کو برگِ گل سمجھے انھیں کو بال و پر جانا

کڑی ہے دھوپ محشر کی ٹھہر اے واعظِ ناداں
ہمارے ساتھ زیرِ سایۂ دامانِ تر جانا

پیام شوق نے اُس آستاں تک تجھکو پہونچایا
ہماری ہی بدولت اے صبا تونے وہ گھر جانا

ہمیشہ نزع ہی میں اُس لبِ جاں بخش نے رکھا
محبت میں شمیم آساں ہم سمجھے تھے مر جانا

بابُ التقریظ والانتقاد

زین الاخبار

مصححہ پروفیسر محمد ناظم، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

پانچویں صدی ہجری عجمی اسلام کی نشأۃ اور قوت کا عہدِ شباب ہے، ایران و ترکستان اور خراسان میں نئی نئی قوتیں ابھرتی اور پھیلتی رہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان عجمی سلطنتوں کی تفصیلی معاصرانہ تاریخوں کا سراغ بہت کم ملتا ہے، دیلمیوں کی عظیم الشان سلطنت کی ایک مکمل تاریخ بھی ہمارے سامنے نہیں، عجم کی سب سے پہلی اسلامی ریاست طاہریہ کی کوئی مستقل تحریری یادداشت نہیں، سب سے پہلی خالص ایرانی اسلامی حکومت صفاریہ کے مختصر لیکن انقلاب انگیز عہد کی کوئی داستان موجود نہیں، متفرق اور پراگندہ بیانات ہیں، جن کو جوڑ کر چاہیں تو ایک تاریخ کا ڈھانچہ کھڑا کر سکتے ہیں، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مسلمان ارباب قلم نے ان واقعات کی کوئی تحریری یادداشت کبھی قلمبند نہیں کی، یعنی ان خاندانوں کی کوئی خاص تاریخ نہیں لکھی گئی ہے، مگر معلوم یہی ہوتا ہے کہ ہماری ناقدرشناسیوں نے ان جواہرات کو ہمارے خزانہ سے برباد کر دیا،

ان بیسیوں قابل ذکر کتابوں میں سے جو اس زمانہ کی تاریخ کا ماخذ ہیں، ایک کتاب زین الاخبار نامی بھی ہے، صاحب طبقات ناصری اور فرشتہ نے غزنویوں کے حالات میں اس کتاب سے فایدہ اٹھایا ہے، اسکے مصنف کا نام ابوسعید عبدالحی بن ضحاک بن محمود گردیزی ہے، اور جس کا زمانہ سنہ ۴۴۲ھ کے قریب ہے، گویا وہ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں بھی موجود تھا، کہ سلطان کی وفات کا سال سنہ ۴۲۱ھ ہے لیکن مصنف سلطانی دربار تک سلطان کے بیٹے زین الملۃ عبدالرشید کے زمانہ میں پہونچا ہے، اور اسی نسبت سے اُس نے اپنی کتاب کا نام زین الاخبار رکھا ہے،

مصنف کے حالات صرف اسی قدر معلوم ہیں، جس قدر خود اُس کی کتاب سے معلوم ہو سکتے ہیں اس کے زمانہ کی تعیین اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اُس نے اپنی کتاب زین الملة سلطان عبد الرشید کے نام سے لکھی ہے، زین الملة سنہ ۴۴۲ھ کے اواخر میں غزنی کے تخت پر بیٹھا اور صرف ایک سال کی حکومت کے بعد طغرل کے ہاتھ سے مارا گیا، اور یہ ظاہر ہے کہ یہ کتاب صرف ایک سال کی محنت کا نتیجہ نہیں ہو سکتی، بنابریں اس کے معنی یہ ہیں کہ گردیزی یہ کتاب لکھنے میں پہلے سے مصروف تھا، اور زین الملة کی تخت نشینی کے زمانہ یعنی سنہ ۴۴۲ھ اور سنہ ۴۴۳ھ کے اندر اس نے تمام کیا،

[illegible]

گردیزی نے اس کتاب میں ایران و ترکستان و خراسان کے عہد قبل از اسلام سے لیکر اپنے زمانہ تک کی مختصر تاریخ لکھی ہے، اس کے دو نسخے انگلستان میں موجود تھے، ایک کیمبرج اور ایک اکسفورڈ میں، زمانہ حال کے بعض یورپین فضلا نے اس کتاب کا پتہ چلایا، اور اپنے مضامین و تصنیفات میں اس کا حوالہ دیا،

میں کہا کرتا ہوں کہ انگلستان کا مذاق جس طرح ہر چیز میں تجارتی ہے، اسی طرح علم میں بھی ہے، جنگ کے بعد سے جرمنی کی طرح انگلستان نے بھی مشرقی علوم کی ڈاکٹری کی ڈگری تقسیم کرنی شروع کی ہے، مگر اس باب میں بھی اس کا مذاق تجارت سے آگے نہ بڑھ سکا، کسی خاص مضمون کی تلاش و محنت اور تحقیق و تدقیق کے بجائے اس نے یہ آسان نسخہ ایجاد کیا ہے کہ جب مشرق کا کوئی طالب علم اس ڈگری کی تلاش میں انگلستان جاتا ہے، تو انگریز اساتذہ اس کے ہاتھ میں کسی کتاب کا قلمی نسخہ تھما دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ وہ مختلف نسخوں اور مختلف کتابوں کو دیکھ کر ان کے مقابلہ اور موازنہ سے ایک صحیح نسخہ تیار کریں، جب یہ عمل ختم ہو جاتا ہے تو طالبعلم کو ڈگری اور پبلشر کو کتاب دیدی جاتی ہے، ع چہ خوش بود کہ بر آید بیک کرشمہ دو کار،

میرا یہ مقصود نہیں کہ میں اس تصحیح و مقابلہ کے مہتم بالشان کام کی اہمیت کا انکار کروں، یہ بجائے خود ایک نہایت مفید، اہم اور قابل قدر کام ہے، مگر اس کام کو ڈاکٹری کی ڈگری کے لئے قرار دینا علم کے ساتھ کتنا تمسخر ہے؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کسی عہد یا کسی خاندان کی کسی قلمی تاریخ یا کسی ایک کتاب کی تصحیح و مقابلہ کی خدمت کی

انجام دہی سے کوئی مستشرقیات کی سند اور اُنکے عہدۂ تدریس و تعلیم کی اہلیت پیدا کر سکتا ہے، کیا انگریزوں نے خود بھی اپنے ملک کے لئے اس قسم کی کوئی تمسخر انگیز سند قابلیت ایجاد کی ہے،

بہرحال یہ تو ان کا حال ہے جن کو ہم نے نہ صرف اپنے ملک و دولت بلکہ اپنے علم و فن کا مالک الرقاب بنایا ہے، طالبین کا اسمیں کیا قصور ہے؟ وہ بہرحال وہاں علم کی تکمیل کے لئے جاتے ہیں اور وہاں اپنے چند سال صرف کرتے ہیں، اور نتیجہ سے کامیاب ہو کر وہ یہاں واپس آتے ہیں، اور اس "تکمیل علم" کی جد و جہد سے جو غرض ہے واپس آکر وہ حاصل کر لیتے ہیں،

لیکن بحمد اللہ کہ جناب ڈاکٹر محمد ناظم صاحب ایم اے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے یہ نہیں کیا ہے، انھوں نے کیمبرج سے غزنوی تاریخ پر ایک محققانہ مقالہ لکھکر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی، اور یہ پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے کیمبرج سے تاریخ کی سند حاصل کی ہے، اس کے علاوہ انھوں نے اپنے شوق سے اس عہد کی جس اہم تصنیف کو ترتیب و تصحیح کے لئے منتخب کیا وہ زین الاخبار تھی، چنانچہ موصوف نے بڑی محنت سے اس کتاب کے ابتدائی حصے کو چھوڑ کر جس میں ایران کی ابتدائی تاریخ سے بنو امیہ اور بنو عباس کے استیلا تک کا حال ہے اور آخر حصہ کو جس میں قوموں کے جشنوں اور عیدوں کے دن مقرر کئے ہیں اور اُن کے رسوم بیان کئے ہیں، باقی حصوں کو جو خراسان کی خود مختاری سے لیکر طاہریہ، صفاریہ، سامانیہ اور غزنویہ کی مختصر تاریخ پر مشتمل ہے، صحیح و مرتب کیا ہے اور "گب میموریل فنڈ" نے اُس کو برلن کے مطبع ایران شہر میں چھپوا کر شایع کیا،

چونکہ اس کتاب کے صرف دو نسخے تھے، اور وہ بھی ایک ہی سے دوسرا منقول تھا، اس لئے ہمارے دوست کو اس کتاب کی تصحیح میں تاریخ اور جغرافیہ کی دوسری کتابوں سے مقابلہ کرنے کی زحمت گوارا کرنی پڑی، جن کی فہرست انھوں نے کتاب کے آخر میں دیدی ہے، مگر تعجب ہے کہ ان میں تاریخ ملوک الارض حمزہ اصفہانی نظر نہیں آتی، جو ان سب میں اسوقت سب سے اقدم ماخذ ممکن تھا،

مرتب و مصحح نے مصنف کا زمانہ قریب سنہ ۴۴۰ھ قرار دیا ہے، میرے خیال میں اس سے آگے بڑھنا ممکن

تھا کیونکہ زین الملۃ جس کے نام سے اس نے یہ کتاب لکھی ہے، وہ ۴۴۲ھ میں تخت پر بیٹھا، اور ۴۴۳ھ میں مارا گیا ہے، گو کتاب کا اصل نسخہ آخر سے ناتمام ہے، اسمیں صرف قطب الملۃ ابو داود ڈنگ کا حال ہے، تاہم آخری حصہ میں عبد الرشید کے نام کے ساتھ "ادام اللہ دولتہ" ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے عہد سلطنت تک تصنیف کی تکمیل میں مصروف رہا ہے،

کتاب کی تصحیح و مقابلہ کے علاوہ مصحح نے آخر میں ناموں کی فہرست بھی لگائی ہے، اور انگریزی میں پانچ صفحوں کا مقدمہ بھی لکھا ہے، جس میں تصنیف اور مصنف کے مختصر حالات بیان کئے ہیں، اس کتاب کی اشاعت سے عتبی اور بیہقی کے علاوہ غزنویوں کی تاریخ کا ایک نیا ماخذ اور لوگوں کے ہاتھوں میں آگیا، جس کے لئے جناب ڈاکٹر محمد ناظم صاحب کا ہم سب کو مشکور ہونا چاہیے، قیمت صہ، ہندوستان میں خود ڈاکٹر صاحب سے اور باہر لیوزک کمپنی بکسیلرس قریب برٹش میوزیم لندن سے ملیگی۔

"س"

حکومتِ خود اختیاری

اور

ہندو مُسلم مسئلہ کا حل

مصنّفہ مولوی سید طفیل احمد صاحب (علیگ) ایم ایل سی

ہندوستان کی سیاسی دنیا میں جو انقلابات پے بہ پے پیدا ہو رہے ہیں اُن سے کون انکار کر سکتا ہے، لیکن یہ خارجی انقلابات اس قدر زیادہ تعجب انگیز نہیں جس قدر یہاں کے دل و دماغ کی دنیا میں انقلاب رونما ہے، کتنے وہ لوگ جو سیاست کو امن کی جنت کا شجر ممنوعہ سمجھتے تھے، اب اس کے پھل کے بغیر ان کو چین نہیں آتا، کتنے وہ جو اس کو اس ظلمات کا آبحیات یقین کرتے تھے، وہ اب اس کو سم قاتل تصور کرتے ہیں، وہ لوگ جو کبھی ہندو مسلم اتحاد کے داعی اور مبلغ تھے، وہ اب اس کے منکر ہیں، اور کتنے اس کے منکر اب اس کے داعی اور مبلغ ہیں، وہ اصحاب جو کبھی سوراج کے نام سے کانپتے تھے، اب وہ اسکے لئے بیخوف کوشاں ہیں، اور وہ ارباب حل و عقد جو کبھی اسکے لئے جان دیتے تھے وہ اس سے دل سے بیزار ہیں۔

انھیں سیاسی انقلابات اور نیرنگیوں کا ایک تماشاگاہ ہمارے کرمفرما مولوی سید طفیل احمد صاحب (علیگ) ممبر کونسل صوبہ متحدہ ہیں، موصوف مسلمانوں میں معاشرتی و اقتصادی اصلاحات و تحریکات کے بانی و ساعی تو مدت سے ہیں، مگر تعجب سے سنا جائیگا کہ آل پارٹیز کانفرنس کی شرکت کے بعد سے وہ سیاسی بھی ہو گئے ہیں اور ایسے سیاسی جن کے معتقدات اب وہ ہیں جو پہلے کبھی مذہب سیاست کے "سابقین اولین" کے تھے،

سید صاحب نے اس زمانہ میں اخبارات میں جو مختلف مضامین لکھے، ان کے علاوہ ایک مستقل کتاب بھی "حکومت خود اختیاری اور ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ کا حل" کے عنوان سے اُردو اور انگریزی میں لکھی ہے، اور عموماً انگریزوں کے بیانات، اعداد و شمار اور واقعات پر اپنے دعوؤں کی بنیاد قایم کی ہے،

کل کتاب ۱۳۲ صفحات پر تمام ہوئی ہے، جو مختلف مطالب کے آٹھ بابوں پر منقسم ہے۔ اور ہر باب ہندوستان کے مختلف سیاسی و اقتصادی مسائل پر مشتمل ہے، پہلے باب میں جو تمہیدی ہے، ان سوالوں کا جواب دیا ہے کہ ہندوستان ترقی کر رہا ہے یا تنزل؛ ملکی بہبودی میں انگریزوں کا کیا حصہ ہے؛ حکومت خود اختیاری کا اعلان اور اسمیں اہل ہند کی بے اطمینانی کے اسباب کیا ہیں؛ دوسرے باب میں مصنف نے کمپنی کی علمداری اور اس علمداری میں ہندوستان کی تجارتی، صنعتی اور اخلاقی تنزل کی دردناک تصویر کھینچی ہے، تیسرا باب دوسرے باب کا تتمہ ہے جس میں کمپنی کی علمداری کی زمینداروں اور کاشتکاروں کے ساتھ طرز عمل پر بحث ہے، چوتھے باب میں غدر اور غدر کے بعد کے حالات اور نئے انگریزی نظام سلطنت اور اس سے اہل ہند کے اخراج اور پھر سیاسی حقوق کے "عطا" ہونے کے سلسلہ کا آغاز ہے، پانچویں باب میں ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کا ظہور اور ہندو مسلمانوں کے درمیان مختلف فیہ مسائل کی پیدایش کی تفصیل ہے، چھٹا باب اہل ہند کی زندگی کے مختلف پہلو، ہندوستانیوں کی قابلیت، ملازمتوں کی کشمکش، ہندوستان کی زرعی، صنعتی، اقتصادی اور تعلیمی حالات کا جائزہ ہے، اور نتیجہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ سیاسی

حقوق جملہ کمزوریوں کا علاج ہیں"، ساتواں باب خاص مسلمانوں کے مختلف شعبہ جاتِ زندگی اور ان کے تعلیمی و سیاسی حالات کے بیان میں ہے، اور ساتھ ہی مسلمانوں کے سامنے کسی نصب العین نہ ہونے کے نتائج ظاہر کئے گئے ہیں، آٹھویں باب میں جو خاتمہ کا باب ہے آل پارٹیز کانفرنس کی تجاویز کی تشریح و تائید ہے، اور اس پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کا جواب ہے۔

پوری کتاب دلائل، واقعات، شواہد، اعداد و شمار اور حوالوں سے لبریز ہے، ہماری رائے میں یہ کتاب سید صاحب کے بہترین کارناموں میں شمار کرنے کے لائق ہے، اور اس قابل ہے کہ اسکو ہر مسلمان غور و فکر کے ساتھ پڑھے اور صحیح نتیجوں تک پہونچے، مسلمان ہندوستان میں بہت دنوں تک خطابت کی زور آوری اور پُرجذبات تقریروں کی جادوگری میں گرفتار رہے، اب انھیں چاہئے کہ وہ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اپنی حالت پر غور کریں اور کسی صحیح نتیجہ تک پہونچیں۔

ہم اس مسئلہ میں مصنف سے بالکل ہم آواز ہیں کہ ہندوستان میں ہنوز مسلمانوں نے اپنی سیاسی زندگی کے کسی نصب العین کا فیصلہ نہیں کیا ہے، اور وہ اب تک میدانِ سیاست میں ایک فٹ بال ہیں جو ہندو اور انگریز کھلاڑیوں کے بیچ میں کبھی ادہر سے ادہر اور کبھی اُدھر سے ادھر اٹھا کر پھینکے جاتے ہیں، یہ حالت کتنی دردناک ہے، بلکہ ہمارا تو یہ اعتقاد ہے کہ مسلمانوں کی ہر قسم کی کمزوریاں بلکہ انکی سردلی، تکان، سست طبعی سب اسی بیماری کا نتیجہ ہے کہ انکے سامنے کسی امنگ اور امید سے بھرے ہوئے مقصد کا کوئی نظارہ نہیں ہے جس کے حصول کا وہ لطف اٹھانے کی کوشش کریں۔

ہم مولوی طفیل احمد صاحب کو انکی اس کامیاب تصنیف پر دل سے مبارکباد دیتے ہیں، اور مسلمانوں سے خواہش کرتے ہیں کہ تھوڑی تکلیف اٹھا کر وہ اس سیاسی آئینہ میں ہندوستان کا چہرہ دیکھیں،

قیمت عہ، ملنے کا پتہ:- نظامی پریس، بک ایجنسی، بدایون، یو، پی

"س"

مطبوعاتِ جدیدہ

شعر و شاعری عصر جدید ایران صہ ۳۲
اقبال و شعر فارسی صہ ۴۸
فرہنگ نویسی فارسی صہ ۴۴

از آقا سید محمد علی پروفیسر نظام کالج حیدرآباد، دکن

قیمت فی رسالہ ۵ر مصنف کے پتہ سے مل سکتے ہیں۔

ایران میں جامعہ معارف ایران ایک علمی انجمن ہے، اور اس کا مقصد ادبیاتِ ایران کی خدمت ہے، اس انجمن کی ایک شاخ حیدرآباد میں بھی قائم ہے اور اسکی خاص غرض یہ ہے کہ ایران اور ہندوستان کے فارسی دوست اصحاب میں علمی و ادبی برادری قایم کی جائے، اور دونوں ملکوں کے انشاپردازوں کو ان کے علمی مشاغل میں مدد دیجائے، فارسی کی تعلیم کے لئے رات کو فارسی کا درس دیا جاتا ہے اور مہینہ میں ایک مرتبہ انجمن کا کوئی رکن کسی خاص موضوع پر ایک خطبہ پڑھکر سناتا ہے، مذکورۂ بالا تینوں رسالے اسی قسم کے تین خطبے ہیں، جو تین مختلف لیکن اہم مضامین پر انجمن کے سامنے حیدرآباد میں دئے گئے ہیں، ان کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لائق خطیب نے کتنے وسیع مطالعہ کے بعد یہ خطبات مرتب کئے ہیں،

فرہنگ نویسی فارسی کے سلسلہ میں انھوں نے جو تجاویز پیش کی ہیں اور ایک جدید لغت کی ترتیب و تدوین کی ضرورت اور طریقہ کو بیان کیا ہے وہ اس قابل ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے اسکو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے،

سیر المصنفین (حصہ دوم) از جناب محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔ اے۔ وکیل صہ ۱۲+۲۰۰۴ قیمت ہے، پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی،

آج سے پانچ سال قبل سنہ ۱۹۲۴ء میں جناب تمنا نے آب حیات کے طرز پر اردو نثر کی تاریخ یا اردو مصنفین کے حالات کی پہلی جلد شایع کی تھی اور اب اسکی دوسری جلد ہمارے پیش نظر ہے، لائق مصنف نے اردو نثر کے پہلے دور کو سنہ ۱۷۹۸ء سے شروع کیا ہے، اور وہ اس بات پر مُصر ہیں کہ تاریخ زبان اردو کے محققین نے اس سے پہلے کی جن تصانیف کا پتہ چلایا ہے وہ اس قابل نہیں ہیں کہ انکو یہ عزت بخشی جائے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"ہم ہرگز شیخ عین الدین گنج العلم سے اور اُن کے مابعد تحسین تک جو مصنفین گذرے ہیں ان سے اردو نثر کے ادوار قایم نہیں کرسکتے کیونکہ ان کی دکنی اردو دراصل اردو ہی نہیں ہے"،

حالانکہ یہ ایک ایسی رائے کا اظہار ہے کہ جس سے کوئی سنجیدہ دماغ اتفاق نہیں کرسکتا، اور اگر وہ دکنی کی اردو کو اردو تسلیم نہیں کرتے، تو پھر معلوم نہیں پروفیسر شیرانی کی "پنجاب میں اردو" کے متعلق وہ کیا کہینگے، یہ بہت بہتر ہوتا کہ لائق مصنف ایسے تمام مصنفین کا ایک مستقل دور قایم کردیتے، اور اس طرح ہمکو ابتدائی اردو مصنفین کے حالات سے واقفیت تو ہوجاتی،

موجودہ جلد سنہ ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۹۱۴ء کے دورسوم کے مصنفین پر مشتمل ہے یہ سرسید مرحوم سے شروع ہوکر جناب شرر پر ختم ہوتا ہے، حاشیہ میں بعض بزرگوں اور بعض موجودہ مصنفین کے حالات بھی دیدیے گئے ہیں، کتاب میں تنقید کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، وہ خاص اصول پر مبنی نہیں ہے، تنقید کا فن خود ایک مستقل فن ہے، اور ایسی کتابوں کے لئے اس کا مطالعہ نہایت ضروری، تاہم جناب تمنا کی یہ کوشش یقیناً ہمت افزائی کی مستحق ہے کہ انھوں نے ایک ایسی چیز کی طرف قدم بڑھایا جو ہمارے ادبی خزانہ میں موجود نہ تھی، اور یقیناً ان کی یہ کوشش آئندہ اور زیادہ گرانقدر ثابت ہوگی۔

کرشمۂ قدرت از جناب محمد لطیف محمد صاحب خستہ انصاری ص ۹۶ قیمت عہ، پتہ: مصنف افریشی ادس، مقام، ضلع پٹنہ۔

حضرت سلمان فارسی رض کو جو خاص امتیاز حاصل ہے اس سے کون انکار کرسکتا ہے، اور اہل دل اصحاب

کی جماعت میں ان کا خاص درجہ رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے حالات میں متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں، اور اب بہار کے ایک نئے مصنف نے اسی سے اپنے سلسلہ کی ابتدا کی ہے، اور اسی سبب سے یہ کتاب کمزوریوں سے بھری ہوئی ہے، دراصل اس کتاب کو مولٰنا عبدالحلیم شرر کے تاریخی افسانہ "جویاے حق" کا ایک عاجلانہ خلاصہ سمجھنا چاہئے اور اسی لئے مولف نے اپنی اس کتاب کو اس طرح لکھا ہے کہ گویا حضرت سلمان رض خود اپنی کہانی اپنی زبانی بیان کررہے ہیں، یہ طریقہ نہ صرف تاریخی وادبی لحاظ سے غلط ہے بلکہ اس مقدس ہستی کے احترام وعزت کو بھی اس سے صدمہ پہونچتا ہے، دوسرے چونکہ ماخذ تمام تر افسانہ ہے، اسلئے یہ کتاب بھی بہت کچھ تاریخی تحقیقات سے بے نیاز ہے، تیسرے اسکی اردو بہت کچھ قابل اصلاح ہے، اور الفاظ کے استعمال میں تو اس قدر بے احتیاطی سے کام لیا گیا ہے کہ دیکھکر صدمہ ہوتا ہے، امید کہ دوسرے اڈیشن میں یہ خامیاں دور ہوجائینگی، اور یہ کتاب واقعی اہل تلاش کے لئے شمع ہدایت ثابت ہوگی،

ثریا کی گڑیا ص ۴۴ }
جادو کا نقطہ ص ۴۴ } از جناب غلام عباس صاحب

اس کتاب کی قیمت ۸ر پتہ: دارالاشاعت پنجاب، لاہور،

جناب غلام عباس صاحب نے مذکورۂ بالا دو ناموں سے کم سن بچوں کیلئے دو چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھے ہیں، ڈرامے بچوں کی ذہنیت کے مطابق اور ان کے مذاق کے موافق ہیں، اسکے ساتھ ہی دونوں میں کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق سکھایا گیا ہے، ہمارے خیال میں ابتدائی مدارس میں ان کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوگی، زبان بھی صاف اور آسان ہے، موخر الذکر ڈرامے میں دو تصویریں بھی دی گئی ہیں،

نکاتِ رموزی (حصہ دوم) از ملا رموزی ص ۲۵۶+ن پتہ دارالاشاعت پنجاب، لاہور،

ملا صاحب ایک انشا پرداز ہونے کی حیثیت سے تقریباً دہ سالہ نوجوان مضمون نگار ہیں، ابتداءً غدر کے وقت کے ملاؤں کی بولی کی نقل سے ظرافت کا رنگ انھوں نے پیدا کیا، اس کے بعد ظریفانہ حکایات لکھے، اور حقیقت یہ ہے کہ بعض خوب لکھے، خصوصاً "ننھے کی والدہ" کی جب وہ باتیں کرتے ہیں تو بہت مزہ دار

کرتے ہیں، ان کا یہ طرزِ انشاایک جداگانہ رنگ نکھار رہا تھا کہ ادھر انھوں نے سنجیدہ نویسی اختیار کرلی، اگر ملا صاحب برا نہ مانیں تو ہمارا مشورہ ہے کہ "یک در گیر و محکم گیر" کا پرانا اصول وہ نہ چھوڑیں، ملا صاحب کے رنگین مضامین کا مجموعہ حصۂ اول کی شکل میں شایع ہوچکا تھا اور اسمیں اُن کے دورِ ثانی کے مضامین ہیں، ابتدا میں مکتبہ حیدرآباد کے مدیر کا مقدمہ ہے، امید ہے کہ رموزی ادبیات کے قدر داں اس تازہ مجموعہ سے لطف اٹھائینگے۔

پارسی علوم اور اسلام مصنفہ جناب پروفیسر محمد مسلم صاحب ایم۔ اے صفحہ ۶۰ قیمت ۱۲ر

پتہ:۔ سینٹ کولمبس کالج، ہزاری باغ، (بہار)

دوسرے ممالک کی طرح ایران کے متعلق بھی متعصب مورخین نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ مسلمانوں نے اسکی فتح کے وقت جہاں اس کا تختِ حکومت چھین لیا، وہیں اس کے علمی کتبخانہ کے ایک ایک ورق کو بھی منتشر و برباد کردیا، اور وہ عہدِ قبل از اسلام کی ایرانی علمی بے بضاعتی کی اسی طرح تشریح کرتے ہیں، اس اعتراض کو پیشِ نظر رکھکر ہمارے لائق دوست نے جن کو "ایرانیات" سے خاص دلچسپی ہے، نہایت ہی سلجھے ہوے محققانہ لیکن مختصر طریقہ سے اس کا جواب لکھا ہے، اور بتایا ہے کہ مسلمانوں نے ایرانیوں کے جو کچھ بھی علمی جواہر تھے ان کو بچایا ہی نہیں بلکہ ان میں حیرت انگیز اضافہ کیا ہے، اور یہ اثر و اضافہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ ملک ہمیشہ کسی نہ کسی سامی قوم کے علمی تفوق کے زیرِ اثر رہا ہے، ایرانی ادبی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ رسالہ نہایت دلچسپ و مفید ہے۔

"ن"